ماہنامہ

تعلیم و تربیت

لاہور

پاکستان میں بچوں کا سب سے زیادہ چھپنے والا رسالہ



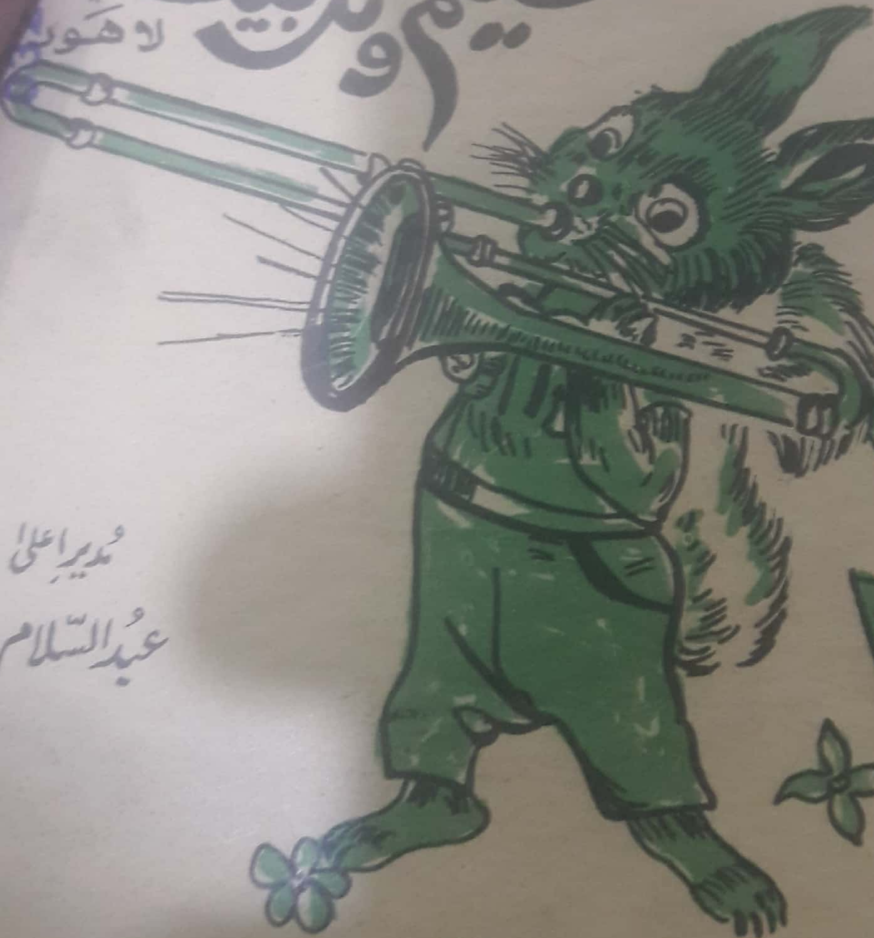
اکتالیسواں سال
گیارھواں شمارہ

فروری 1982ء

ماہنامہ

تعلیم و تربیت

لاہور



مُدیرِ اعلیٰ

عبدُالسّلام خان

یکے از مطبوعات :
فیروز سنز لمیٹڈ ۶۰ شاہراہِ قائدِ اعظم، لاہور

قیمت سالانہ : 33.00
قیمت سالانہ مع رجسٹری : 53.00
3.00

فہرست

پہلے یہ پڑھیے!

عزیز بچو! اس وقت آپ کے محبوب اور پسندیدہ رسالے ماہنامہ تعلیم و تربیت کا جو شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے، وہ فروری کا شمارہ ہے۔ اس کے بعد کا شمارہ مارچ کا شمارہ ہوگا اور پھر اپریل سے ہمارے اس رسالے کی نئی جلد کا پہلا شمارہ "سالنامہ" ہوگا۔

ہمیں آپ کے خطوں سے اس بات کا مکمل اندازہ ہے کہ آپ لوگ ہر بار کس شوق اور دلچسپی سے سالنامے کا انتظار کرتے ہیں۔

آپ لوگ یہ پڑھ کر خوش ہوں گے کہ اس بار ہمارا سالنامہ اپنے مضامین کے اعتبار سے پہلے عام شماروں بلکہ سالناموں سے بھی زیادہ دلچسپ اور شاندار ہوگا۔ سالنامے کے سلسلے میں ایک ہمارا یہ خیال ہے کہ اسے ایک طرح کا "کہانی نمبر" بنا دیا جائے۔ کیوں کہ ہمیں معلوم ہے کہ آپ کہانیاں زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اس لیے ہماری یہ خواہش اور کوشش ہے کہ سالنامے کے ذریعے سے آپ کو زیادہ سے زیادہ کہانیاں پڑھنے کا موقع دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے ہم خاص طور پر بعض بڑے ادیبوں سے کہانیاں لکھوا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ خود بچوں کی لکھی ہوئی کہانیاں بھی زیادہ سے زیادہ سالنامے کی زینت بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ہم اپنے سالنامے کے بارے میں ابھی زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ ہماری کوشش ہے کہ آپ سالنامہ دیکھ کر خود یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ واقعی اس سالنامے کا جواب نہیں۔

سالنامے میں بہت سے صفحات رنگا رنگ ہوں گے۔ اس کے بارے میں بعض ضروری تفصیلات ہم آپ کو آیندہ بتائیں گے۔ آپ ابھی سے دوستوں کو بتا دیجیے کہ "تعلیم و تربیت" کا اپریل کا پرچہ سالنامہ ہوگا، جو پوری آب و تاب اور شان و شوکت سے آ رہا ہے۔

اڈیٹر

Scanned by CamScanner

ہمارے نبیؐ نے فرمایا!

- بے شک اللہ پاک ہے۔ وہ صرف پاک چیزوں کو پسند کرتا ہے۔
- جو بات تم کو شک میں ڈالے، وہ چھوڑ دو اور جو شک میں نہ ڈالے، وہ اختیار کرو۔
- تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک ایمان دار نہیں ہوتا، جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی کچھ نہ چاہے جو وہ اپنے لیے چاہتا ہے۔
- جو شخص اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ اچھی بات کہے یا چُپ رہے۔
- جو شخص اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ اپنے ہمسائے کی عزت کرے۔
- جو شخص اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے، اُسے چاہیے کہ اپنے مہمان کی عزّت کرے۔
- ایک شخص نے نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم سے کہا: مجھے کوئی نصیحت فرمائیے۔ آپؐ نے فرمایا: غصّہ نہ کیا کرو۔ اس شخص نے اپنی بات بار بار دہرائی: آپؐ نے پھر فرمایا: غصّہ نہ کیا کرو۔
- تم جہاں کہیں بھی ہو، اللہ سے ڈرو اور اگر کوئی غلطی ہو جائے تو اس کے فوراً بعد نیکی کرو۔ کیوں کہ وہ گناہ کو مٹا دے گی۔
- لوگوں کے ساتھ نیک سلوک کرو۔
- اللہ کو یاد رکھو، اللہ تم کو یاد رکھے گا۔
- جب مانگو تو خُدا سے مانگو اور جب مدد چاہو تو اللہ سے چاہو۔
- مدد صبر کے ساتھ ہے۔

عبدالستار آثم

میرا دیس ہے پاکستان

میرا دیس ہے پاکستان
اس پر قربان میری جان
اِس کی شان ہے میری شان
میرا دیس ہے پاکستان
اپنا دیس سجاؤں گا
اس کی شان بڑھاؤں گا
کردوں گا تن من قرباں
میرا دیس ہے پاکستان
پاکستان کا پیارا ہوں
سچ مچ راج دُلارا ہوں
اس پر ہے میرا ایمان
میرا دیس ہے پاکستان
اس کے ذرّے لعل و گہر
دلکش سب دیوار اور در
دلکش دریا اور میدان
دیس ہے میرا پاکستان

ہر پل ، ہر لمحہ ، ہر آن
اپنے شعر ، اپنا دِیوان
آثم کر اِس پر قربان
میرا دیس ہے پاکستان

سرور بجنوری



چرخ چوں

لکھنؤ میں تھا ایک چرخ چوں
اُس کا قصہ تمھیں سُناتا ہوں

اس کے والد نے اس کو خط لکھا
سیر معجون بھیج دو بیٹا!

خط کے ملتے وہ چل دیا بازار
چار دن سے اگرچہ تھا بیمار

ڈبّا معجون کا بھرا لایا
خوش ہوا جی میں خوب اِترایا

اگلے دن ڈاک خانے جا کے کہا:
"اس کا محصول کس قدر ہوگا؟"

منشی جی نے اسے دیا یہ جواب
بارہ آنے لگیں گے اس کے جناب!

سخت حیران تھا وہ چرخ چوں
اتنا محصول کس طرح میں دوں

ایک ترکیب اس کو یاد آئی
جس کو سمجھا وہ عین دانائی

بارہ آنے تو میں نہیں دوں گا
وزن کم کر کے ڈبّا بھیجوں گا

اس نے معجون کو نکال دیا
پھر سے محصول کا سوال کیا

تول کر پوسٹ ماسٹر نے کہا
"آٹھ آنے کا بوجھ گھٹ ہی گیا

چار آنے کے اب ٹکٹ لاؤ
اور ہم سے رسید لے جاؤ"

الغرض پارسل روانہ ہوا
اس نے دل میں ذرا نہیں سوچا

اصل شے میں سے پھینک ڈالی ہے
ڈبّا معجون سے تو خالی ہے

باپ کو کس قدر گلا ہو گا
پارسل جب اسے ملا ہو گا

رضا میر

گل دان

زندگی میں غم اور خوشی تو آتے جاتے رہتے ہیں۔ آدمی بہت سی گزری ہوئی باتوں کو بھلا دیتا ہے۔ لیکن زندگی میں ایسے واقعات بھی آتے ہیں جن کو بھلایا نہیں جا سکتا۔

میں بھی اس دن کو نہ بھلا سکوں گا۔ جس دن علی سے میری معمولی واقفیت گہری دوستی میں بدل گئی اور مجھے احساس ہوا کہ میں کس قدر بُرا ہوں کہ سزا سے بچنے کے لیے میں نے جھوٹ بولا۔ اور اُسی دن میں نے یہ بھی سمجھا



کہ میں اتنا بُرا انسان بھی نہیں ہُوں کہ اپنے گناہوں کا بوجھ دوسرے کے کندھوں پر ڈال دُوں۔

میری زندگی کا رُخ موڑنے کا یہ دن اس وقت آیا جب میں تیسری جماعت میں پڑھتا تھا۔

میری بہن نازلی نے بلّی کا ایک بچّہ پال رکھا تھا۔ جو ہر وقت ادھر اُدھر بھاگتا دوڑتا اور اُچھلتا کودتا رہتا تھا۔ جب سے یہ بچّہ آیا تھا، گھر کی کوئی نہ کوئی چیز ٹوٹتی ہی رہتی تھی۔

علی اور اس کی بہن زہرا اور ان کے ماں باپ کچھ ہی دن ہوئے ہمارے پڑوس میں آکر آباد ہوئے تھے۔ علی مجھ سے ایک سال بڑا تھا۔ بڑا ہنس مکھ اور ملنسار، ہم پہلے ہی دن ایک دوسرے سے واقف ہو گئے۔ چند دنوں کے بعد میں نے زہرا کو دیکھا جو پانچ سال کی ایک پیاری سی بچّی تھی۔ وہ طوطی کی طرح بڑی پیاری پیاری باتیں کیا کرتی تھی۔

میری والدہ کا خیال تھا کہ اگر میں علی کے گھر جاؤں گا تو علی کی والدہ کے لیے تکلیف کا باعث بنوں گا۔ البتہ میری والدہ نے علی سے کہ رکھا تھا کہ جب اس کا جی چاہے، وہ ہمارے گھر آجایا کرے۔

گھر کے سبھی لوگ علی کو پسند کرتے تھے۔ صرف میری دادی امّاں کو وہ اچھا نہیں لگتا تھا۔ آپ کو پتا ہے، میری دادی امّاں! بچّوں سے کیوں نفرت کرتی ہیں؟ ان کا کہنا تھا کہ بچوں کو ہر وقت پڑھنا چاہیے لیکن جب علی آجاتا ہے تو لکھنا پڑھنا چھوڑ کر علی کے ساتھ کھیل کود میں لگ جاتا ہے۔

پچھلے پہر میں ادھر سے نکلا تو میری ملاقات علی سے ہو گئی۔ میں جانتا تھا کہ آج اس کی امّی اور نازلی گھر پر نہیں۔ میں نے علی سے کہا "آج تم ہمارے ہی گھر آجانا۔"

علی نے کہا "مجھے کچھ ضروری کام ہے اگر فرصت مل گئی تو آجاؤں گا۔"

علی سے الگ ہو کر جب میں گھر پہنچا تو میرے ابّا گھر پر نہیں تھے۔ گھر

میں صرف دادی امّاں تھیں۔ انھوں نے جب مجھے دیکھا تو کہنے لگیں "آؤ۔۔۔! چائے پی کر بیٹھ جاؤ اور مدرسے کا کام کرو"

میں نے کہا "دادی اماں! آج مدرسے کا کوئی کام نہیں کرنا۔ نہ کوئی کام ملا ہے۔"

امّی بھی گھر پر نہیں تھیں۔ مجھے اپنا گھر خالی خالی نظر آرہا تھا۔ میں نے چائے پی اور صحن میں چلا آیا اور فٹ بال کھیلنے لگا۔ دادی نے فٹ بال کی آواز سنی تو کھڑکی سے جھانک کر کہا "میں نے کیا کہا تھا؟ بیٹھ کر اپنا کام کرو۔"

میں نے کہا "آج سکول کا کوئی کام نہیں ملا۔"



دادی اماں غصّے سے کہنے لگیں "میں جانتی ہوں تو سچّی بات نہیں کر رہا تجھے پڑھنے لکھنے سے زیادہ کھیل پسند ہے۔"

دادی اماں کی باتیں مجھے اچھّی نہ لگیں۔ اس دن میرے خالو گھر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ میری خالہ گھر پر اکیلی تھیں۔ اس لیے مجھے خالہ کے گھر سونا

تھا۔ میں نے سوچا: دیر ہوگئی ہے، اب شاید علی نہ آئے۔ بہتر ہے کہ میں خالہ کے گھر چلا جاؤں۔ میں نے دادی اماں سے کہا "میں خالہ کے گھر جا رہا ہوں۔"

دادی اماں نے مجھے گھور کر دیکھا اور کچھ کہا بھی جو میں سن نہ سکا۔ پھر وہ کھڑکی سے ہٹ گئیں اور باورچی خانہ میں چلی گئیں۔

میں نے باہر جانے کے لیے دروازہ کھولا۔ یکایک خیال آیا کہ دیکھوں کیا وقت ہوا ہے۔ گھڑی دادی اماں کے کمرے میں تھی۔ ان کا کمرہ ایک عجائب گھر سے کم نہ تھا۔ سارے کمرے میں، کھڑکی کے سامنے الماریوں میں، اور انگیٹھی پر۔ غرض جہاں تک نظر جاتی تھی، رنگا رنگ اور خوش نما چیزیں دکھائی دے رہی تھیں۔ پرانے زمانے کے چینی کے برتنوں کی الماری الگ ہے۔ ایک خوب صورت سنہری گھڑی میز پر رکھی رہتی ہے۔ جو بڑا صحیح وقت دیتی ہے۔

میں فٹ بال سے کھیلتا ہوا دادی اماں کے کمرے میں داخل ہوا ___ فٹ بال کو کک لگائی۔ بال ہوا میں اچھلا، یکایک میز پر گرا۔ میں فٹ بال کو پکڑنے کے لیے تیزی سے آگے بڑھا تو میز سے ایک گل دان چھن سے زمین پر گر کر ٹوٹ گیا۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ والدہ مجھے ہمیشہ کہا کرتی تھیں؛ خبردار! دادی اماں کے کمرے میں نہ جانا اور نہ ان کی کسی چیز کو ہاتھ لگانا۔ وہ بہت قیمتی چیزیں ہیں۔

میں جانتا تھا کہ دادی اماں کو گل دان ٹوٹنے کا پتا چلے گا تو وہ چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیں گی۔ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ دادی اماں نے گل دان ٹوٹنے کی آواز سن لی ہوگی اور وہ آیا ہی چاہتی ہیں۔

میں نے فٹ بال اٹھایا اور تیزی کے ساتھ کمرے سے دوسرے دروازے سے باہر نکل کر صحن میں آگیا۔ اب میں گلی میں آیا اور بھاگنے لگا۔ جب میں گھر سے نکلا تھا تو میں نے دادی اماں کے آنے کی آواز سن لی تھی۔ وہ باورچی خانے سے اپنے کمرے کی طرف تیزی سے آرہی تھیں۔ پھر میں نے سنا کہ وہ زور زور سے بول رہی تھیں جیسے کسی سے باتیں کر رہی ہوں۔ میں نے سمجھا شاید ابا جان آگئے

ہیں اور ان سے باتیں کر رہی ہیں۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ بس میں بے تحاشا بھاگا جا رہا تھا۔ میں نے نازلی کی بلی کے متعلق بھی سوچا اور یہ بھی کہ اب کل صبح ہی گھر جاؤں گا دادی اماں جانتی ہیں کہ میں خالہ کے گھر گیا ہوا ہوں۔ گل دان نازلی کی بلی نے توڑا ہے۔ اس سے کچھ تسلّی تو ہوئی۔ مگر میں اب بھی ڈر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کتنا بُرا واقعہ پیش آیا ہے۔ مجھ میں سچ بولنے کی ہمت نہ تھی اور گھر بھی نہ لوٹ سکتا تھا۔ دیر تک میں یونہی گھومتا رہا۔



میں نے سوچا ابھی کافی وقت ہے۔ کیوں نہ علی کے گھر وقت گزارنے کے لیے چلا جاؤں۔ میں علی کے گھر پہنچا۔ دروازہ کھُلا تھا اور زہرا دروازے پر بیٹھی رو رہی تھی۔ میں اور بھی گھبرا گیا اور زہرا کے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے پُوچھا "زہرا! کیوں رو رہی ہو؟

زہرا نے کوئی جواب نہ دیا اور وہ روتی رہی۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس

نے روتے ہوئے کہا "علی رو رہا ہے۔ علی رو رہا ہے!"

میں نے حیرت سے پوچھا "علی کو کیا ہوا؟ علی کیوں رہا ہے؟"

زہرا نے روتے ہوئے کہا "تمھارے والد ہمارے گھر آئے تھے۔ انھوں نے میری ماں سے کچھ باتیں کیں۔ پھر میری ماں اور تمھارے والد علی کو بُرا بھلا کہنے لگے۔ پھر میری ماں باہر چلی گئیں۔ علی اندر رو رہا ہے۔"

میں اندر چلا گیا۔ زہرا نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ علی رو رہا تھا اور بڑا پریشان تھا۔ میں نے پوچھا "علی! زہرا کیا کہ رہی ہے؟ کیا ہوا؟ علی نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا اور روتے ہوئے کہا:

"تمھیں معلوم نہیں کیا ہوا ہے؟"

میں نے کہا "مجھے تو کچھ پتا نہیں۔"

علی نے کہا "میں نے تجھے کہا تھا نا کہ میں تمھارے گھر آؤں گا۔ میں گیا مگر تم گھر پر نہیں تھے۔ میں نے کچھ دیر تمھارا انتظار کیا لیکن تم نہ آئے۔"

"پھر؟" میں نے پوچھا۔

"جب میں تمھارے گھر گیا تو دروازہ کھلا تھا۔ میں نے تمھاری دادی اماں کے کمرے میں کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز سُنی۔ کھڑکی کھلی تھی۔ جونہی میں کھڑکی کے پاس پہنچا تمھاری دادی اماں کمرے میں داخل ہوئیں۔ انھوں نے چاروں طرف دیکھا پھر چلّائیں اور کوستی ہوئی میری طرف دوڑیں۔ میں بھاگ کر اپنے گھر آگیا۔"

اس کے بعد تمھارے والد ہمارے گھر آئے اور میری ماں سے کہنے لگے کہ علی نے ہمارا قیمتی گل دان توڑ دیا ہے اور ایک قیمتی گھڑی چُرا کر بھاگ آیا ہے۔ میں نے بہت صفائی پیش کی لیکن تمھارے والد نے ایک نہ سُنی اور سخت سُست کہتے ہوئے چلے گئے۔ ان کے بعد میری امّی بھی چلی گئیں۔ تاکہ میرے والد کو میری کرتوت بتائیں۔ وہ ابھی کام سے واپس نہیں آئے۔"

یہ سُن کر میرا سارا جسم کانپ اُٹھا۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ میں علی سے کوئی بات نہ کر سکا اور بغیر کچھ کہے وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔

گھر آ کر میں سیدھا دادی اماں کے کمرے میں گیا۔ وہ اس وقت اسی کمرے میں تھیں۔ میں بدحواسی میں انھیں سلام کہنا بھی بھول گیا اور بڑی تیزی کے ساتھ میز کے نیچے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ گل دان کے گرنے سے گھڑی بھی نیچے گر گئی تھی اور دادی امّاں کے تخت کے نیچے پڑی ہوئی تھی۔ میں نے گھڑی اُٹھائی اور کمرے سے باہر آ گیا۔ دادی اماں میرے پیچھے ہی آ رہی تھیں۔



میں سیدھا والد صاحب کے پاس پہنچا اور گھڑی اُن کے ہاتھ میں دے دی اور بغیر ان کی طرف دیکھے میں سارا واقعہ سچ سچ بیان کر کے چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔

والد صاحب کچھ دیر تک خاموش رہے پھر بولے "میں نے تمھاری کئی غلطیاں معاف کی ہیں۔ لیکن آج تمھیں معاف نہیں کروں گا۔ میں تجھ ایسی اولاد سے سخت شرمندہ ہوں۔ تیری جلد بازی اور بھاگنے سے امّاں کو شبہ ہوا کہ یہ سب کچھ علی نے کیا ہے جو عین اسی وقت تمھیں ملنے کے لیے آ گیا تھا۔ اب ہم علی کا سامنا کیسے کر سکیں گے؟"

میرا سر جھکا ہوا تھا۔ میرے والد اُٹھ کھڑے ہوئے اور مجھے کہا:

"چلو!"

تھوڑی دیر کے بعد میں اور میرے والد صاحب علی کے گھر میں تھے مجھے یقین نہ آتا تھا کہ میرے والد میرے سچ بولنے کا تمام واقعہ بیان کر دیں گے اور میری اور اپنی زیادتی کو مان لیں گے اور مجھے یہ بھی یقین نہ تھا کہ علی اور اس کے گھر والے ہمیں معاف کر دیں گے لیکن میرے والد نے جو کچھ مجھ سے سُنا تھا، صاف صاف بیان کر دیا اور اپنی غلطی کی معافی مانگی علی اور اس کے گھر والوں نے ہمیں خوش دلی سے معاف کر دیا۔ اب میں یُوں محسُوس کر رہا تھا کہ میرے دل پر سے ایک بھاری پتّھر ہٹ گیا ہے۔

اس واقعہ نے میری اور علی کی معمولی واقفیت کو گہری دوستی میں بدل دیا۔ یہ وہ دن تھا جب میں اس بات کو سمجھا کہ میں کس قسم کا انسان ہوں اور مجھے کیسا ہونا چاہیے۔

اِنسانی عجُوبے:

حضُور اکرمؐ کے ایک صحابی حضرت سلمہؓ اس قدر تیز دوڑتے تھے کہ تیز بھاگتے ہوئے گھوڑے کو پکڑ لیتے تھے۔

زرقاءِ الیمامہ عرب کی ایک مشہور عورت کی نظر اس قدر تیز تھی کہ وہ کسی ٹیلے پر چڑھ کر تین روز کے فاصلے سے آتے ہوئے قافلوں کو دیکھ لیتی تھیں۔

عباسی خلیفہ معتصم باللہ کے ہاتھوں میں اس قدر طاقت تھی کہ وہ دو انگلیوں سے دینار کو رگڑ کر اس کے نقوش مٹا دیتے تھے۔

انسان اور شیطان

آصف ملک



ان دنوں پولیس کو ایک سمگلر کی تلاش تھی۔ پولیس کو اطلاع ملی تھی کہ ایک سمگلر نہایت ہی ہوشیاری سے ہیروں کی سمگلنگ کرتا ہے۔ پولیس کے محکمے نے انسپکٹر عدنان کے سابقہ ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے اس سمگلر کی گرفتاری کا کام انھیں سونپ دیا تھا۔ انسپکٹر عدنان اس ہوشیار سمگلر کو گرفتار کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔ مگر ابھی تک انھیں کوئی خاطر خواہ کامیابی نصیب نہ ہو سکی تھی۔

آفاق ایک غریب ماں کا بیٹا تھا۔ اس کے والد کا تو بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ اس کی ماں محلے کے لوگوں کے کپڑے سی سی کر گزارا کرتی تھی اور آفاق

کو تعلیم بھی دلوائی تھی۔ آفاق نے اسی سال میٹرک کا اِمتحان دیا تھا اور آج اس کا نتیجہ نکلنے والا تھا۔
"امّی! امّی۔۔۔۔ میں پاس ہو گیا ہوں۔ میں اوّل آیا ہوں" آفاق خوشی سے چیختا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ مگر یہ کیا۔۔۔ اس کی امّی تو ایک چارپائی پر آنکھیں موندے لیٹی تھیں۔
"کیا بات ہے امّی؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"
مگر اس کی امّی نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس کمزوری سے آنکھیں کھول کر بند کرلیں۔ پھر اچانک ایک خیال اس کے ذہن میں آیا۔ وہ جلدی سے باہر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ محلّے کے ڈاکٹر سلیم کے ساتھ گھر میں داخل ہوا۔ ڈاکٹر نے اس کی ماں کا معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ اسے ٹی بی ہو گئی ہے جس کے علاج پر بہت رقم خرچ ہو گی۔
"مگر ڈاکٹر صاحب! یہ رقم میں کہاں سے لاؤں گا" آفاق نے کہا۔
"پریشانی کی ضرورت نہیں ہے۔ تم سیٹھ داراب کے بنگلے پر چلے جاؤ۔ وہ بہت خدا ترس انسان ہیں۔ تمھاری مدد ضرور کریں گے" ڈاکٹر سلیم نے کہا اور پھر وہ چلے گئے۔
آفاق اسی وقت سیٹھ داراب کے بنگلے کی جانب چل دیا۔ اتّفاق سے سیٹھ صاحب گھر ہی پر موجود تھے۔ آفاق نے ان کو سارے حالات بتا دیے۔ سیٹھ داراب آفاق کے ساتھ نہایت شفقت سے پیش آئے۔ انھوں نے آفاق کو پانچ ہزار روپے کا چیک بھی دیا اور اسے اُوپر کے کام کاج کے لیے ملازم بھی رکھ لیا۔ آفاق سیٹھ داراب کے گھر پر کام کرنے لگا۔ اس نے اپنی ماں کا علاج بھی کرایا۔
اس کی ماں اب صحّت یاب ہوتی جا رہی تھی۔ سیٹھ داراب اتنے معمولی کام کے عوض اسے اچھی خاصی تنخواہ دیتے تھے۔ اس لیے اس نے ایک نائٹ کالج میں بھی داخلہ لے لیا۔

رات کے بارہ بجے ہوں گے۔ سیٹھ داراب لان میں کھڑے بے چینی سے کسی کا انتظار کر رہے تھے۔ چند لمحے بعد ایک شخص لان میں داخل ہوا۔

"کون؟" سیٹھ داراب نے پوچھا۔

"وائی تھری" اس شخص نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ اندر آؤ" وائی تھری سیٹھ داراب کے پیچھے چل دیا۔

"مال لے آئے؟"

"یس، باس! یہ لیجیے" وائی تھری نے کہا۔ اور ہیروں سے بھرا ہوا ایک تھیلا اس کو دے دیا۔



"بہت خوب، کام نہایت ہوشیاری سے کیا تھا نا؟" سیٹھ داراب نے اس سے پوچھا۔

"یس باس، کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ مارکیٹ آج دس بجے تک بند ہو گئی تھی۔ میں ایک ہیروں کی دکان کا تالا توڑ کر اندر داخل ہوا اور ہیرے

نکال لایا۔

"ویری گڈ۔ لو یہ رہا تمھارا انعام" سیٹھ داراب نے کہا اور ایک نوٹوں کی گڈی وائی تھری کو دے دی۔

"شکریہ باس! میں آپ کو پسند کرتا ہوں باس! آپ نہایت ہوشیار ہیں" وائی تھری مسکرا دیا۔

"یس وائی تھری! میں بہت ہوشیار ہوں" سیٹھ نے کہا "دنیا مجھتی ہے میں بہت خدا ترس انسان ہوں۔ مگر اسے نہیں معلوم کہ میں ہیروں کا کتنا بڑا اسمگلر ہوں۔۔۔"

"میرا خیال ہے اب کھیل ختم ہو جائے انسپکٹر صاحب!" اچانک آفاق اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے چھ سپاہی بھی تھے۔ جن کے پستولوں کا رُخ سیٹھ داراب کی طرف تھا۔

"ہاں، تم ٹھیک وقت پر آئے آفاق" وائی تھری نے کہا۔ "ہتھکڑیاں لگا لو۔ سیٹھ داراب! میں وائی تھری نہیں انسپکٹر عدنان ہوں۔ وائی تھری تو گرفتار ہو کر جیل بھی پہنچ گیا۔ تمھاری اور میری گفتگو ٹیپ بھی ہو چکی ہے" انسپکٹر عدنان نے کہا اور کوٹ کی جیب سے ایک ننھا ٹیپ ریکارڈر نکال کر سیٹھ داراب کو دکھایا۔

"گرفتار کر لو اِسے"

پھر دو سپاہیوں نے سیٹھ داراب کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔

"تم حیران ہو گے کہ آخر یہ سب کس طرح ہوا۔ لو میں تمھیں بتاتا ہوں۔ دراصل کل آفاق کسی کام سے تمھارے کمرے میں گیا۔ تم کسی سے فون پر گفتگو کر رہے تھے۔ تم کہہ رہے تھے، وائی تھری، لیاقت سُپر مارکیٹ کی دکان نمبر 37 کے ہیرے چوری کر کے کل رات گیارہ بجے میری قیام گاہ پر پہنچ جاؤ۔ یہ گفتگو آفاق نے سُن لی تھی۔ اسی لیے وہ فوراً وہاں سے واپس ہو لیا۔ آفاق تمھارے بہروپ کو جان چکا تھا۔ ایک طرف تمھاری نمک خواری

کا مسئلہ تھا اور ایک طرف وطن کا مفاد تھا۔ لہٰذا آفاق نے وطن کو زیادہ اہمیت دی اور پولیس کو سارے حالات سے آگاہ کر دیا۔ پولیس نے وائی ٹخری کو لیاقت مارکیٹ ہی میں گرفتار کر لیا۔ اور تمھارے ساتھ یہ ڈراما اس لیے اسٹیج کیا تاکہ تمھارے خلاف ثبوت فراہم ہو سکے "

سیٹھ داراب خاموش کھڑا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔

" تمھارے فعل تو انسانوں جیسے ہیں مگر تم حقیقت میں ایک شیطان ہو۔" انسپکٹر عدنان نے کہا۔

پھر وہ سیٹھ داراب کو گرفتار کر کے تھانے لے گئے۔



دوسرے دن پورے ملک میں سیٹھ داراب کی گرفتاری کی خبر جنگل کی آگ کی مانند پھیل گئی۔ حکومت نے آفاق کو انعامات سے نوازا، اس کی مفت تعلیم کا ذمہ لیا اور اس کی ماں کے علاج کے لیے وظیفہ مقرر کر دیا۔

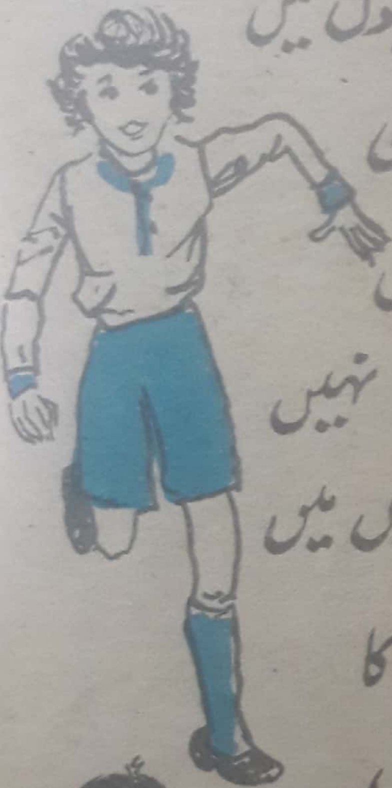
راجا رشید محمود

کیسا ہوں میں

مُنہ کو دھو لیتا ہُوں جس دن ، فخر سے کہتا ہُوں میں
دیکھ کر بتلائیے مُجھ کو کہ کیوں کیسا ہُوں میں



صحن کو میدان کرکٹ کا سمجھتا ہُوں حضُور !
دوستوں کے ساتھ بھی یا جس گھڑی تنہا ہُوں میں



آپ ٹیڑھا جان کر توہین کرتے ہیں مری
لوگ کہتے ہیں ، جلیبی کی طرح سیدھا ہُوں میں

تیز رفتاری میں مجھ سے کوئی بڑھ سکتا نہیں
مدرسے سے چل کے گھر کی سمت جب آتا ہُوں میں

کیا پتا مُجھ کو عزیزو ، صُبح کے انوار کا
دن چڑھے تک ٹانگیں پھیلائے ہوئے سوتا ہُوں میں



کامراں، عمران سے ہر شام لڑتا ہے ضرور
ماموں کے ہاں جا کے یہ کچھ دیکھتا رہتا ہُوں میں

دس منٹ میں نقل کر سکتا ہوں کاپی آپ کی
مدرسے کے کام میں تو تیز کچھ ایسا ہُوں میں

سہیلی کے گھر

زیب النساء علیم، کراچی



"امّی میں فوزیہ کے گھر جاؤں گی" ہم نے کہا۔

"کیوں؟" امّی نے پیاز کاٹتے کاٹتے سر اُٹھایا۔

"امّی! فوزیہ بہت عرصے سے کہہ رہی ہے کہ میرے گھر آ — آج چلی جاؤں؟" ہم نے امّید بھری نظروں سے امّی کی طرف دیکھا۔

"امّی! میں بھی جاؤں گا" خرم جو پاس ہی بیٹھا ہوا تھا، یک دم بولا۔

"خاموش رہو جی تم" ہم نے خرم کو جانے سے روکا۔

"نہیں امّی! زیبی کے ساتھ میں بھی جاؤں گا۔"

"زیبی، تم نے میرا نام لیا! اب تو ہرگز نہیں۔" ہم نے بہانہ کیا۔
"اوہ! بھول گیا زیبی باجی! میں بھی اب بدتمیزی نہیں کروں گا۔"
"اگر تم کو جانا ہے تو خرم کو لے جاؤ۔ یہ بھی گھوم آئے گا" امّی نے یک دم اجازت دے دی۔

ہم خوش بھی ہوئے اور جھنجھلائے بھی کہ یہ صاحب زادے بھی ساتھ چلیں گے۔

خرم ہمارا چھوٹا اور مُنّا سا بھائی ہے۔ گھر بھر میں شیطان کے نام سے مشہور ہے۔ شکل سے معصوم اور ایسا معصوم کہ بس۔ اب کسی کو کیا معلوم کہ یہ صاحب زادے تو شرارت کے پلندے ہیں۔

خیر ہم فوزیہ کے گھر جانے کے لیے تیّار ہوئے اور چل دیے ــــ اللہ اللہ خیر سلّا۔ مگر افسوس کی بات یہ ہوئی کہ آدھے راستے میں خرم صاحب کی چپل ٹوٹ گئی۔

"ہم نے پہلے ہی منع کیا تھا کہ پتّھروں پر مت چلو، مگر تم ہو کہ بس" ہم نے خرّم کو گھورا۔

اب ان کو واپس بھی نہیں بھیج سکتے تھے اور اگر خود چھوڑنے جاتے تو یہ دوسری چپل پہن کر چلنے کو تیار ہو جاتے اور اس طرح بات وہیں پر آ جاتی جہاں سے چلی تھی۔

سو ہم نے بھی صبر کی انتہا کر دی اور ان کی چپل وہیں سڑک کے ایک کونے میں بیٹھ کر جوڑنے لگے۔ مگر چپل بھی خرّم کی طرح ڈھیٹ تھی کہ ٹھیک ہی نہ ہوتی تھی۔ ہم نے نہایت صبر کے ساتھ چپل خرّم کے ہاتھ میں دے دی اور کہا "اب چلو"

اب یہ حال ہے کہ خرم کے ایک ہاتھ میں چپل، دوسرا ہاتھ ہمارے ہاتھ میں۔ ایک پیر ننگا اور دوسرے پیر میں چپل اور اسی حلیے میں فوزیہ کے گھر چلے۔ ہم واپس اس لیے نہیں گئے تھے کہ اب واپس چلے گئے تو

دوبارہ آنا محال ہو جائے گا۔

راستے میں ایک جگہ کتّوں کی گول میز کانفرنس ہو رہی تھی۔ ہم کو دیکھ کر وہ ہمارے استقبال کو آگے آئے اور اس کے باوجود کہ ہم ان کے لیے اور وہ ہمارے لیے اجنبی تھے "بھوں بھوں" کر کے ہم کو ڈرا ہی دیا۔ ایک دلیر سے کتّے نے خرّم پر چھلانگ لگا دی مگر کوشش ناکام ہو گئی۔ اب ہماری عقل شریف میں یہ بات آئی کہ یہ بدتمیز آوارہ کتّے اس کم بخت ٹوٹی ہوئی چپل کو گوشت کا ٹکڑا سمجھ رہے تھے۔ اس وقت جی چاہا کہ کتّوں کی عقل پر ماتم کریں۔ مگر وقت کم اور مقابلہ سخت تھا۔



ہم نے ایک بڑا پتھر اُٹھایا، جو یقیناً ہمارے قد سے چھوٹا تھا۔ اور کتّوں کی طرف اُچھال دیا۔ کتّے تھے ذرا ڈرپوک، اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔ مگر وہ دلیر کتّا کم بخت نہ بھاگتا اور نہ ہم کو جانے دیتا تھا۔ ہم نے وہ ٹوٹی چپل اور دوسری چپل خرّم کے پیر سے نکال کر کتّے کی مخالف

سمت دور پھینک دی۔ کتا چپل کی طرف بھاگا اور یہاں سے ہم بھاگے۔ مگر جلدی میں خرم صاحب گر گئے اور لگے رونے چلانے۔ بڑی مشکل سے ٹافیوں کا لالچ دے کر خاموش کرایا۔

اب چلنے لگے تو ننگے پیر میں کانٹا چبھ گیا۔ ننگے پیر ہونے کے سبب ہم نے ان کو چھوٹے منے کی طرح اٹھایا اور راستے میں رک رک کر فوزیہ کے گھر پہنچ گئے۔

فوزیہ سے خوب باتیں کیں۔ اِدھر اُدھر کی۔ تقریباً ہر موضوع پر۔ پھر فوزیہ یہ کہہ کر "میں ابھی آتی ہوں" چلی گئی تو ہم دونوں ڈرائنگ روم کی سجاوٹ دیکھنے لگے۔

"زیبی باجی! میں ایک کھلونا لے لوں، وہ بھالو والا؟" خرم نے معصومیت سے کہا۔

ہم نے سختی سے منع کر دیا اور نہیں تو کیا پرائی چیز تھی نا۔ تھوڑی دیر کے بعد فوزیہ چائے اور بسکٹ کیک وغیرہ کے ہمراہ آئی۔

"بھئی واہ! ماشاءاللہ، بڑی تیاری کی ہے۔ یہ سموسے اور بسکٹ گھر کے بنے ہوئے ہیں یا بازار کے" ہم نے پوچھا۔

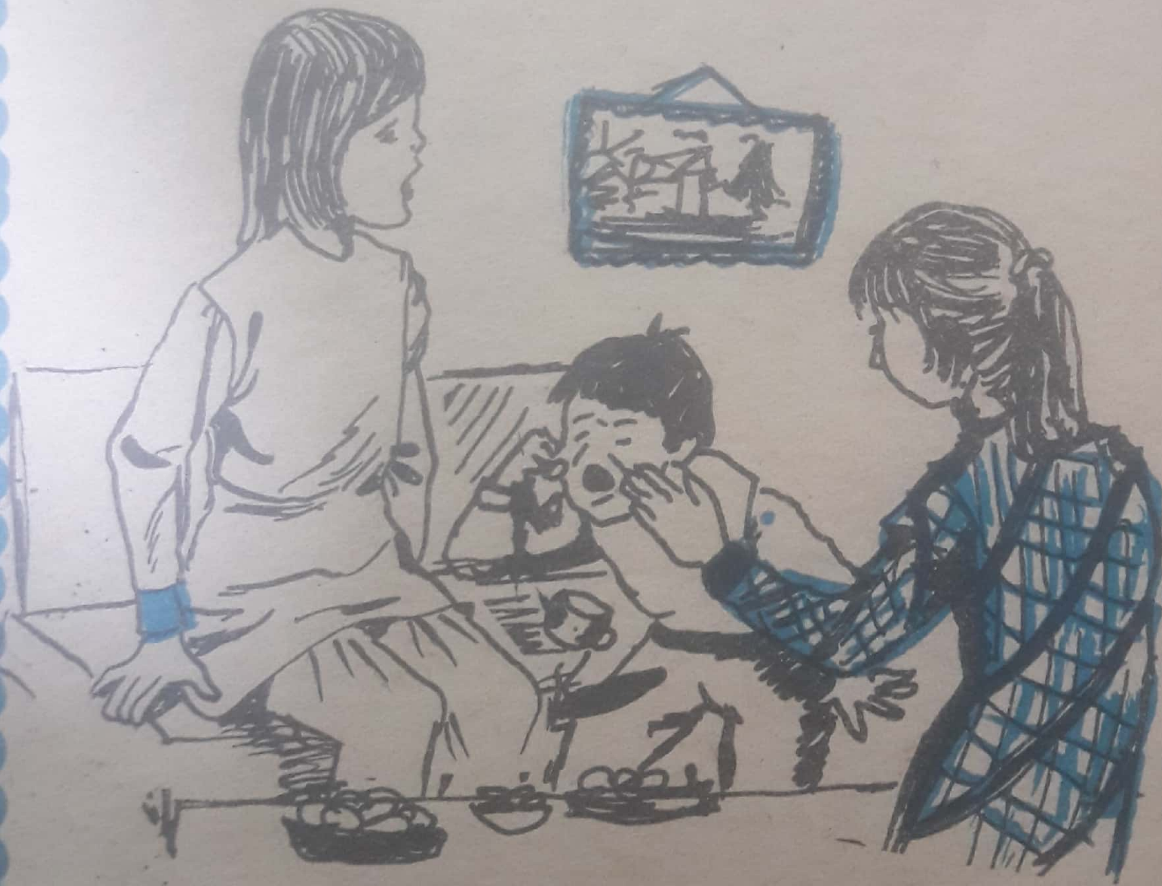
"بازار سے منگوائے ہیں۔" فوزیہ مسکرائی۔

"معلوم ہے۔ میں سموسے اور نمک پارے خود ہی بنا لیتی ہوں" ہم نے اپنی تعریف آپ کی۔" اور بڑے مزے کے۔ کسی روز ہمارے گھر آنا پھر خود دیکھ لینا۔"

"نہیں جی! زیبی باجی جھوٹ بول رہی ہیں۔ ان کو بنانے نہیں آتے" خرم نے کہا۔

"ارے اس کی باتوں میں مت آنا۔ بڑا بدتمیز ہے۔ چلو یہ بسکٹ کھاؤ" ہم نے خرم کی توجہ بسکٹوں کی طرف کر دی۔ اور نہیں تو کیا۔ وہ ہماری شیخی کا بھانڈا پھوڑ رہا تھا۔

"آج کل چھٹیاں ہیں۔ کیا کرتی ہو؟" ہم نے پوچھا۔
"کچھ خاص مصروفیت نہیں ہے۔ بس کہانیوں کی کتابیں پڑھتی رہتی ہوں" فوزیہ نے لاپروائی سے کہا اور خرّم کو دیکھنے لگی۔ جو پورا اسموسہ منھ میں رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔
یہ دیکھ کر ہم بڑے سٹپٹائے۔ جب فوزیہ چائے بنانے لگی تو ہم نے نظر بچا کر خرّم کے چٹکی بھری کہ بدتمیزی مت کرو۔ مگر خرّم جس کی ساری توجّہ کھانے پر تھی، ایک دم اُچھلا۔ اور اتّفاق سے اُسی وقت فوزیہ نے خرّم کی طرف چائے بڑھائی۔ اچانک یہ ہوا کہ گرم گرم چائے خرّم کی ٹانگوں کو جلا گئی۔ خرم جلدی سے جھکا اور "ہائے امّی! اُوں اُوں، ہُوں" کرنے لگا۔



"ارے ارے دومنٹ۔ آؤ تمھاری ٹانگیں دھو دُوں" ہم نے خرّم کو اُٹھایا "دھیان سے بیٹھا کرو" ہم نے کہا اور فوزیہ کے ہمراہ غسل خانے میں چل دیے۔
تھوڑی دیر کے بعد ہم نے کہا "اچھا اب چلنا چاہیے، اجازت"
"نہیں جی تھوڑی دیر تو ہوئی ہے" فوزیہ نے کہا۔
"نہیں، امّی نے کہا تھا 'جلدی آنا' اگر دیر ہوگئی تو امّی پھر کبھی

آنے نہیں دے گی" ہم نے وضاحت کی۔ "فوزیہ! معاف کرنا تمہاری چائے کی پیالی ٹوٹ گئی۔"

"ارے چھوڑو۔ ہمارے ہاں تو آئے دن چھوٹے بہن بھائی برتن توڑتے رہتے ہیں۔"

"اچھا اب چلتے ہیں۔ ارے خرّم کہاں ہیں" ہم نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں مگر خرّم غائب۔

"ڈرائنگ روم میں ہوگا" فوزیہ نے کہا۔

"آؤ چل کر دیکھتے ہیں" ہم نے کہا۔

جاکر دیکھا تو واقعی صاحب زادے ڈرائنگ روم میں براجمان تھے اور بسکٹ کھانے میں مصروف۔

"تم بہت ندیدے ہو گئے ہو" ہم نے اپنی شرمندگی مٹانی چاہی۔

"اچھا خُدا حافظ! اب تم ہمارے گھر آنا" ہم نے جاتے وقت فوزیہ کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔

"راستے میں خرّم نے کہا "زیبی باجی! بسکٹ کھائیں گی؟"

"بکواس مت کرو۔ خاموشی سے چلو۔ تم نے فوزیہ کے ہاں بہت بدتمیزی کی۔ گھر جاکر تمہاری پٹائی کرنی ہے" ہم نے اپنے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"زیبی باجی! آپ سارے بسکٹ لے لیں۔ مگر ماریے گا نہیں" خرّم نے اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

"تمہارے پاس بسکٹ کہاں سے آئے" ہم نے خرّم کو سوالیہ نظروں سے گھورا۔

"آپ کی سہیلی کے ہاں سے جب آپ دوسرے کمرے میں تھیں نا، تو میں نے ڈرائنگ روم میں جاکر بہت سارے بسکٹ اپنی جیبوں میں بھر لیے" خرّم نے اپنی جیبیں دکھائیں "اور جو باقی بچ گئے، وہ میں نے

کھا لیے " خرم مسکرایا۔
" ارے واہ! تم تو بہت چالاک ہو گئے ہو "
ہم نے کہا مگر اُوپری دل سے مسکرا کر کہا۔ ورنہ جی چاہتا تھا کہ خوب پٹائی کریں۔ مگر یہ سوچ کر کہ گھر جا کر سارے کس بل نکال دیں گے۔ راستے میں غصّے کی کیا ضرورت ہے اور پھر ہم نے یہی کیا تو خرّم نے روتے ہوئے کہا۔" اگر میں نے چائے کی پیالی توڑ دی تو کیا ہُوا؟ ان کے گھر تو برتن ٹوٹتے رہتے ہیں "۔
" چلو ٹھیک، یہ بات مانے لیتے ہیں، چائے کی پیالی اتفاقاً ٹوٹ گئی مگر بسکٹوں والا معاملہ "۔
" میں نے بسکٹ اُٹھائے تو کیا ہوا " خرّم اُٹھتا ہوا بولا اور دروازے کے پاس جا کر کہا " میں نے بسکٹ اُٹھائے تو آپ سموسے اُٹھا لیتیں، منع کس نے کیا تھا؟ " خرّم نے گویا ہم کو مشورہ دیا۔
" ٹھہر جا شیطان! کھلاتی ہوں بسکٹ اور سموسے " ہم نے اپنے ہاتھ پر ہاتھ مارا تو خرم صاحب ایسے بھاگے کہ امّی کے پاس جا کر دم لیا۔
" امّی! زیبی باجی مارتی ہیں " خرم نے ہماری شکایت کی۔
ہم نے ساری بات بتائی۔ تو امّی نے خرم کو پیار سے سمجھایا۔ صاحبزادے گردن ہلانے لگے اور ہم کو دیکھ دیکھ کر مسکرانے لگے۔
" بچّوں کو پیار سے سمجھایا کرو۔ ہر وقت کی مار کٹائی ہرگز اچھی بات نہیں ہے " امّی نے خرّم کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
اب ہم کیا کہتے کہ یہ خرّم کا بچّہ اتنا شریر ہے کہ اس کا اندازہ شاید آپ کو بھی نہیں۔ یہ تو ہم سے پوچھیے کہ ان کی شرارت اور بدتمیزی کا نشانہ اکثر ہم ہی بنتے ہیں۔ " لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے " یہ مثل خرّم پر بھی صادق آتی ہے۔ اب آپ ہی بتائیے۔ ایسی حرکت پر ہم ان کو ماریں یا پیار کریں ☩

محمد اقبال انجم



گپ شپ

(ہفتے کے دِن)

بات ہوئی ہے کھیر کی
ہو گی دعوت پیر کی

چرچا ہے جس دنگل کا
ہو گا وہ دن منگل کا

کیسے بیٹھے ہو بے سُدھ
کام کرو کہ آج ہے بُدھ

پاؤ گے اچھی سوغات
آنے تو دو جمعہ رات

گنتے تھے اِک اِک لمحہ
چُھٹی کا دِن ہے جمعہ

دن گزرے رفتہ رفتہ
آ پہنچا آخر ہفتہ

ہوئی ہے کیسی موج بہار
کھیل کا دن ہے یہ اتوار

شہناز انجم، جوہر آباد



شوق

ہم اکثر سوچتے ہیں کہ لوگوں کو ڈھیروں قسم کے شوق ہوتے ہیں اور ایک ہم ہیں کہ شوق کا لفظ ہماری طبیعت سے گدھے کے سینگوں کی طرح غائب ہے۔ لو بھلا، یہ بھی کوئی زندگی ٹھہری۔ یونہی اس بات کا ذکر ہم نے غزالہ سے کر دیا۔ پہلے تو اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو گھماتے ہوئے ہمیں گویا یوں گھورا کہ ہم لڑکھڑا گئے اور اسی لڑکھڑاہٹ کے دوران میں ہم نے سوچا۔ لاحول ولا قوۃ، یہ شاعر لوگ اسی قسم کی بھیانک آنکھوں کو

ہرنی کی آنکھوں کا نام دیتے ہیں کہ جنھیں دیکھ کر ہمیں تو مارے خوف کے کچھ سے کچھ نظر آئے بلکہ کچھ بھی نہ نظر آئے۔ پھر دانت نکوستے ہوئے بولی :

"شوک ـــ ؟" "بس بس، خُدا کے لیے بس" اس سے ہم نے فوراً اُسے روک دیا۔ پہلے کہ ہمیں خُدا ناخواستہ کسی قسم کا شاک لگتا ہم وہاں سے اُٹھ کر چل دیے۔

ایک دن یونہی بیٹھے بیٹھے ایک خوب صورت خیال ذہن میں در آیا۔ کیوں نہ کوئی زبان سیکھی جائے۔ اوہ ..... بہت اچھے۔ ہاں یہ شوق بہت اچھا رہے گا۔ اب کم از کم ہم بھی کسی کو بتا سکتے ہیں کہ جی ہمیں فلاں شوق ہے۔ مگر کون سی زبان سیکھی جائے؟ اُردو تو ہماری مادری اور قومی زبان ہے۔ پنجابی پر تو ویسے ہی عبور حاصل ہے کہ پنجاب کے "جم پل" جو ٹھہرے۔ رہا انگریزی کا مسئلہ تو وہ سکول کالج میں پڑھنے کی حد تک آتی ہے۔ اس سے زیادہ سیکھ کر کیا کرنا ہے اور ویسے بھی ہم انگلش بول کر لوگوں کو ہونق بنانا نہیں چاہتے۔

پشتو..... ارے ہاں۔ بڑا دھانسو خیال ہے۔ پشتو سیکھی جائے۔ ارمان بھائی جان سے ذکر کیا تو انھوں نے ایسا بُرا مُنھ بنایا جیسے خدا ناخواستہ پیٹ میں شدید قسم کا مروڑ اُٹھا ہو۔ ہا خُدا! پشتو ایسی بوجھل زبان ہے۔ ابھی تو لفظ پشتو بولا ہے اور بھیا کا یہ حال ہے کہ ہضم نہیں کر پائے۔ اگر واقعی ہم نے پشتو بولنی سیکھ لی تو کیا ہوگا۔ ہمیں ساتھ ہی بھیا کی فکر ہو گئی۔ مگر وہ ہماری سوچوں سے لاتعلق بڑی مشکل سے بولے :

"پشتو..... ہشت پگلی۔ یہ کوئی زبان ہے۔ جیسے کسی برتن میں بہت سے پتھر ڈال کر کوئی ہلا رہا ہو۔ ایسے ہی پشتو زبان کانوں سے ٹکراتی ہے، جب کوئی بول رہا ہو۔"

ہم نے بھی غور کیا تو واقعی بھیا نے سچ کہا تھا مگر اب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ہم ایک برتن اور ڈھیر سارے پتھر اُٹھائے پھریں۔ جہاں ضرورت

پیش آئی برتن کو پوری قوت سے ہلانا شروع کر دیا۔ یہ بھائی جان تو بس شروع سے ہماری شخصیت کے دشمن ہیں۔ آپ ہی سوچیے ایسی صورت میں ہم کس قدر عجیب لگیں گے۔ گلے میں بڑا سا برتن اور ہاتھوں میں ڈھیر سارے پتھر۔ ہونہہ! بڑے آئے بھیا کہیں گے۔

اس کے بعد کسی سے ہم نے مشورہ لینا ہی چھوڑ دیا اور یہ ہماری خوش قسمتی ٹھہری کہ ہمارے پڑوس میں ہمسایوں کے ہاں چند لڑکیاں آئیں۔ ان میں سے ایک کو پشتو بھی آتی تھی۔ بس ہم نے ان سے زبردستی دوستی گانٹھی اور انھیں اپنا استاد بنا لیا، جب ان سے اپنے شوق کا اظہار کیا تو انھوں نے عجیب نظروں سے اپنی دوسری کزن کو دیکھا اور پھر حامی بھر لی۔



دوسرے دن سے ہم نے ان سے پشتو سیکھنی شروع کر دی۔

ایک دو ہفتے میں ہمیں کچھ کچھ پشتو بولنی آ گئی اور سیکھے ہوئے جملے روانی سے بولنے لگی۔

ایک دن ہم اپنی امی جان کے ساتھ کسی کے ہاں گئے۔ وہاں پہلے

سے ان کے ہاں چند عورتیں مہمان بیٹھی تھیں۔ ابھی ہمیں بیٹھے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ ان دونوں نے آپس میں پشتو بولنی شروع کر دی مگر وہ ہمارے سر پر سے بغیر کسی اثر کے گزرنے لگی۔ آخر ہم سے نہ رہا گیا۔ ہم نے اپنی پشتو کو آزمانے کے لیے اُن سے کہا:

"آنٹی! مجھے بھی پشتو آتی ہے اگر آپ کی اجازت ہو تو چند باتیں آپ سے پشتو میں کر دوں؟"

وہ خاتون مسکرائیں اور انھوں نے مجھ سے پشتو میں میرا نام پوچھا۔ میں نے بھی پشتو ہی میں جواب دیا تو وہ خاتون بے اختیار ہنس پڑیں پشتو میں کچھ بولیں۔ میں نے بھی جواب دیا۔ یک لخت وہ محترمہ خاموش ہو گئیں۔ پھر تھوڑی دیر بعد کچھ اور بولیں جو میرے سر پر سے گزر گیا۔ مگر میں نے اپنی عقل کے استعمال سے سمجھا اور انھیں جواب دیا۔

اب میں انھیں پشتو میں اپنی تعلیمی سرگرمیوں کے بارے میں بتا رہی تھی۔ اب تو میں شروع ہو گئی اور جو جو جملہ سیکھا ہوا تھا، بغیر رکے بولتی گئی۔ ان خاتون کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور پھر نجانے انھیں کیا ہوا۔ انھوں نے مجھے دو تین تھپڑ جڑ دیے۔ جو یقیناً پشتو ہی میں مارے تھے۔ کیوں کہ چوٹ زبردست پڑی تھی۔ درد کی شدّت سے ہم چیخ اُٹھے۔

ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے سب لوگ حیران ہو کر ہمیں دیکھنے لگے۔ ادھر ہم بھی حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھے کہ یا الٰہی! یہ ان مہذب خاتون کو کیا ہو گیا۔ ہم نے تو فقط پشتو ہی بولی ہے کوئی گالی تو نہیں دی۔ کیا ان جملوں کا مطلب بھی تمھیں معلوم تھا؟ ان کے ساتھ والی خاتون نے مجھ سے پوچھا "ساری پشتو بول اور سمجھ سکتی ہو؟"

ہم نے کہا "نہیں۔ صرف یہی جملے جو بولے ہیں۔"

انھوں نے پوچھا "ان کا مطلب آتا ہے؟"

ہم نے سادگی سے خوب صورت بالوں والا سر ہاں میں ہلا دیا۔

وہ حیران ہو کر بولیں "پھر بھی خالہ جان کو تم نے یہ سب کچھ کہا تھا"
اب ہمارے پریشان ہونے کی باری تھی۔ آخر ہم نے پوچھا " بات کیا ہے ؟ "

انھوں نے بتایا " جو جملے تم نے خالہ جان سے بولے ہیں نا، اُن کا مطلب ہے۔ میرا نام شہناز ہے۔ میں ایک بندریا ہُوں۔ آپ کا نام کیا ہے؟ اچھا موٹی بھینس، چڑیل، بھوتنی میں فلاں کلاس میں پڑھتی ہوں۔ آپ بڑی ذلیل ہیں، منحوس ہیں۔ اللہ آپ مرجائیں، آپ کے ہاتھ ٹوٹیں اور..." بہت کچھ ان خاتون نے بتایا جس میں کہ مخاطب کو بُرا بھلا کہا گیا تھا۔



اب تو ہم واقعی سخت پریشان ہو گئے کہ اچھی پشتو بولی یعنی کہ ہمیں غلط سکھایا گیا تھا۔ مارے شرمندگی اور غصے کے ہمارا عجیب حال تھا۔ ہم نے اسی وقت ان خاتون سے معافی مانگی۔ اور اسی وقت آیندہ سے پشتو سیکھنے سے توبہ کرلی۔ اب خُدا ہی جانے کہ ہمیں غلط جملے سکھائے گئے تھے یا ان محترمہ نے ترجمہ غلط کیا۔ کچھ کہنے سے قاصر ہیں کہ پشتو سے اب تک ناواقف ہیں۔ ویسے ارمان بھیا بھی سچ کہتے تھے۔ خیر اب تو ہم نے ہر قسم کے شوق سے توبہ کرلی ہے۔





شہ بالا

رانا داؤد علی خان



جب سے ہم نے اس جہاں میں قدم رکھا ہے، اب تک صرف ایک بار ہی شہ بالا بننے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ لیکن آیندہ ہمارا شہ بالا بننے کا کوئی ارادہ نہیں۔ کیوں کہ ہم پہلے ہی شہ بالا بن کر دل برداشتہ ہو چکے ہیں۔ ویسے کان اِدھر لائیں ہم آپ کو ایک راز کی بات بتائیں۔ دراصل ہم اُس دفعہ بھی دھوکے ہی سے شہ بالا بنے تھے۔ اب یقیناً آپ کے ذہن میں یہ سوال اُبھرے گا کہ وہ کیسے تو لیجیے سُنیے! ہماری کہانی ہماری زبانی:

چچا جان کی شادی کا دن قریب آتا جا رہا تھا اور ہمارے گھر کی رونق میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ سارا دن عورتوں کا تانتا بندھا رہتا جو اکثر اپنے نورِ چشموں کے ہمراہ غل غپاڑے کا باعث بنتیں۔ امّی جان تمام دن مصروف لیے بیٹھی رہتیں۔ کہیں خالہ جان دوسری خواتین کے ساتھ بیٹھی ڈھولک بجاتیں اور شادی کے گیت گاتیں۔ اودھر اُن کے لاڈلے خُوب دھما چوکڑی مچاتے حتیٰ کہ سارا گھر ہی سر پر اُٹھا لیتے۔ اور خالہ جان کے گیت بھی اُن کے شور و غل میں دب کر رہ جاتے۔

بھائی جان کی تو شان ہی نرالی تھی۔ دن بھر اکڑتے اور سینہ پُھلائے رہتے۔ کیوں کہ شہ بالا کے لیے اُنھی کا انتخاب کیا گیا تھا۔ اُن کی خوب خاطر تواضع ہوتی۔ ان کے لیے نئے کپڑوں کے درجنوں جوڑے۔ نئے جوتے اور دوسری بہت سی چیزیں لائی گئیں۔

ہم یہ سب کچھ دیکھ کر کڑھتے اور اپنی قسمت پر روتے کہ ہمیں شہ بالے کے لیے کیوں نہیں منتخب کیا گیا؟

وقت پر لگا کر اُڑتا رہا۔ شادی میں صرف ایک دن رہ گیا۔ کل صُبح سات بجے بارات کی روانگی تھی۔ اسی شام ہمارے ذہن میں ایک عجیب و غریب اور گھٹیا قسم کا خیال آیا۔ ہمارے اندر کا شیطان ہمیں اس بات پر مجبور کر رہا تھا کہ چونکہ شہ بالا بننے کا اصل حق دار تو ہے، اس لیے اس کو کسی طریقے سے راہ سے ہٹا دے اور خُود شہ بالا بن جا۔ ہم نے بہت کوشش کی کہ اس خیال سے جان چھڑائیں لیکن وہ ہمارے ذہن پر بُری طرح غالب ہو چکا تھا۔

آخر انسان خطا کا پُتلا ہے۔ ہم بھی شیطان کے بہکانے میں آ ہی گئے۔ لیکن پھر بھی ہم نے سُلطان موٹے کو اپنا راز دار بنانا بہتر سمجھا۔ کیوں کہ وہ ہمارا بہترین دوست تھا اور ہمیں اچھا مشورہ دے سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کام میں ہمیں اس کی مدد درکار تھی۔

سُلطان موٹا بھی ہمارا ہی ہم خیال تھا۔ بھائی جان کا شہ بالا بننا شاید اُسے بھی ناگوار گزرا تھا۔ اس نے ہمارا مکمل ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا۔

"لیکن تم شہ بالا کیسے بن سکو گے؟" سلطان موٹے نے پوچھا

"یہ کون سی مشکل بات ہے۔ ہم بھائی جان کو کلوروفارم سنگھا کر بے ہوش کر دیں گے۔ اس کے بعد انھیں غسل خانے میں لے جائیں گے تم بھی غسل خانے میں بھائی جان کے ساتھ رہو گے اور دروازہ اندر سے بند رکھو گے۔ اگر کوئی پوچھنے آئے تو کہ دینا کہ تم نہا رہے ہو" ہم نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔



"لیکن اس طرح تو میں بارات کے ساتھ نہیں جا سکوں گا" سلطان موٹے نے حسرت بھری نظروں سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یار! تم اپنے دوست کی خاطر یہ معمولی سی قربانی بھی نہیں دے سکتے"

"اچھا اچھا! چلو یہ قربانی تو میں دے ہی لوں گا۔ لیکن اگر انھوں نے تمھاری بجائے کسی اور کو شہ بالا بنا دیا تو پھر۔۔۔؟" سُلطان موٹا سوالیہ نظروں سے ہمیں گھورنے لگا۔

"اوہ۔ نہیں یار! ایسا ہو ہی نہیں سکتا" ہم نے بڑے مضبوط لہجے

میں جواب دیا۔
اگلے دن صبح ہی صبح ہم دونوں اُٹھے اور چپکے سے بھائی جان کے کمرے میں گھس گئے۔ بھائی جان بستر پر لیٹے میٹھی نیند سو رہے تھے۔ ہم نے جلدی سے بھائی جان کو کلوروفارم سنگھا کر بے ہوش کیا اور گھسیٹ کر غسل خانے میں لے گئے۔ سلطان موٹے نے اندر سے غسل خانے کا دروازہ بند کر لیا اور ہم کمرے سے نکل کر تیاری میں مصروف ہو گئے۔
صبح کے سات بج چکے تھے۔ بارات روانگی کے لیے تیار کھڑی تھی۔ دولہا میاں اپنی کار میں تشریف رکھ چکے تھے لیکن شہ بالا صاحب کا کوئی پتا نہیں لگ رہا تھا۔ ابا جان نے پہلے انھیں ان کے کمرے میں ڈھونڈا۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔ کپڑے جوں کے توں پڑے ہوئے تھے۔ پھر ابا جان نے غسل خانے کا دروازہ کھٹکھٹایا اور پوچھنے لگے۔
"اندر کون ہے بھئی!"
"چچا جان! میں ہوں اندر۔ نہا رہا ہوں" اندر سے سلطان موٹے کی آواز سنائی دی۔
ابا جان حیران و پریشان ہمارے پاس آئے اور بھائی جان کے متعلق دریافت کرنے لگے۔
"بھائی جان تھوڑی دیر پہلے اپنے ایک دوست کے ہاں گئے تھے۔ کہتے تھے ابھی واپس آ جاؤں گا" ہم نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔
ابا جان بھائی جان کا انتظار کرنے لگے۔ آدھ گھنٹا گزر گیا لیکن بھائی جان نہ آئے۔
"الو کہیں کا! دوست سے ملنا کیا ضروری تھا" ابا جان غصے سے بڑبڑا رہے تھے "اب کیا کیا جائے؟"
"آپ داؤد کو شہ بالا کیوں نہیں بنا لیتے؟" ماموں جان نے کہا۔
"اوہ ہاں۔ میرا اس طرف خیال ہی نہیں گیا تھا۔ اس بدھو کو تو نہ جانے

کب واپس آنا ہے؟"۔ یہ کہہ کر ابا جان نے ہمارے سر پر سہرا باندھا اور ہمیں چچا جان کے پہلو میں بٹھا دیا۔

ہمارا منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا تھا اور ہماری شہ بالا بننے کی آرزو پوری ہو چکی تھی۔ لیکن شہ بالا بننے کے بعد جو حشر ہمارا ہوا، وہ غالباً ہمیں اپنے کیے کی سزا ملی تھی۔

ڈیڑھ گھنٹے میں بارات گوجرانوالہ پہنچی۔ ہمارا بڑا پُرجوش استقبال کیا گیا۔ ہم اکڑ کر چچا جان کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور ساتھ ہی کچھ شرمانے کی ناکام اداکاری بھی کر رہے تھے۔



ہماری بدقسمتی کی ابتدا یہیں سے ہی ہو جاتی ہے۔ تمام باراتیوں کو دیوان خانے کی طرف لے جایا جانے لگا۔ ابا جان کے ہاتھ میں اٹھنیوں اور چونیوں سے بھری ہوئی ایک تھیلی تھی۔ وہ بار بار اس میں ہاتھ ڈالتے مٹھی بھر کر پیسے نکالتے اور اوپر اچھال دیتے۔ جن میں سے اکثر باراتیوں

کے سروں پر پڑتے۔ بچوں اور بڑوں کا ایک ہجوم آگے بڑھتا تھا اور پیسے لوٹنے میں مصروف ہو جاتا تھا۔

یکایک ہماری نظر نیچے پڑی۔ ہم سے چند قدم دُور چند اٹھنیاں زمین پر پڑی ہمارا منہ تک رہی تھیں۔ ہم نے للچائی ہوئی نظروں سے انھیں دیکھا۔ ابھی ہم انھیں اُٹھانے کے لیے نیچے جھکے ہی تھے کہ پیچھے سے ایک زور دار دھکا پڑا اور ہم سیدھے چچا جان کے قدموں میں جا گرے۔ ہم منہ بسورتے ہوئے اُٹھے اور اُن کے ساتھ چل دیے۔

ابھی چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ ہمیں پھر ایک جگہ بہت سی اٹھنیاں پڑی نظر آئیں۔ ہمارے دل میں ایک بار پھر لالچ پیدا ہوا۔ ہم ان اٹھنیوں کو اُٹھانے کے لیے نیچے جھکے۔ اسی لمحے ایک اور ہاتھ بھی ان کی جانب بڑھا لیکن ہم نے اس سے پہلے ہاتھ بڑھا کر انھیں اُٹھا لیا۔ لیکن ہماری قسمت پیچھے سے ایک زور دار کِک لگی اور ہم ایک بار پھر سجدے میں تھے۔ اٹھنیاں ہمارے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑیں۔

ایک لڑکے نے جلدی سے انھیں اُٹھانا چاہا۔ ہم بھی اُن کی طرف لپکے۔ اس وقت ہم یہ قطعی طور پر ہی بھول چکے تھے کہ ہم ایک شہ بالے ہیں اور ہمیں ایسی حرکت نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن اس وقت تو ہم پر صرف ایک ہی دھن سوار تھی۔ اس سے پہلے کہ ہم پیسے اُٹھاتے۔ اس لڑکے نے جلدی سے انھیں اُٹھا لیا۔ ہم غصّے سے بے قابو ہو کر اس کی طرف لپکے۔

"نکال میرے پیسے۔ یہ میں نے اُٹھائے تھے" ہم نے کہا۔

"تمھیں پیسے اُٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔ تم تو خود شہ بالے ہو۔ پیسے تو ہم جیسے غریب اُٹھاتے ہیں" اس لڑکے نے پیسے جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"اوہ ہاں!" ہمیں ایک دم یاد آ گیا کہ ہم تو شہ بالے ہیں۔۔ یعنی کہ حد ہو گئی ہم شہ بالے ہو کر پیسے لوٹ رہے ہیں! ہم نے دل ہی دل میں

سوچا اور شرمندگی سے ارد گرد دیکھا۔ تمام لوگوں کی نظریں ہماری جانب ہی اٹھی ہوئی تھیں اور۔۔۔۔ بے اختیار ہمارا جی چاہا کہ کاش یہ زمین پھٹ جائے اور ہم اس میں سما جائیں۔۔۔

ویسے آگے کی کہانی قطعی کچھ دلچسپ نہیں۔ آپ کیا کریں گے سُن کر۔ بس اتنا بتا دیتا ہوں کہ واپس آکر ہمارا جو مذاق اڑایا گیا، اس کی وجہ سے ہم مہینے بھر گھر سے باہر نہیں نکل سکے۔

اصلی نام:

- امام غزالیؒ کا اصلی نام ابوحامد محمدؐ ہے۔
- محمدؐ بن قاسم کا اصلی نام عماد الدین ہے۔
- ابن الہیثم کا اصلی نام ابو علی حسن ہے۔
- سلطان صلاح الدین کا اصلی نام یوسف ہے۔
- شیرشاہ سوری کا اصلی نام فرید خان ہے۔
- بُو علی سینا کا اصلی نام حسین بن عبدُاللہ ہے۔
- شہید تیتو میر کا اصلی نام میر نثار علی ہے۔
- سراج الدولہ کا اصلی نام محمد مرزا ہے۔
- بہادر شاہ ظفر کا اصلی نام ابوالمظفر سراج الدّین ہے۔
- ابن بطوطہ کا اصلی نام ابوعبداللہ محمدؐ ہے۔
- جمال الدین افغانیؒ کا اصلی نام سیّد محمدؐ بن صفدر ہے۔
- محمدؐ تغلق کا اصلی نام جونا خان ہے۔
- غیاث الدّین بلبن کا اصلی نام بہاؤالدین ہے۔

(محمودُ عالم۔ لطیف آباد، حیدرآباد)

محمد اسلام - لاہور

ذرا ذہن آزمائیے؟

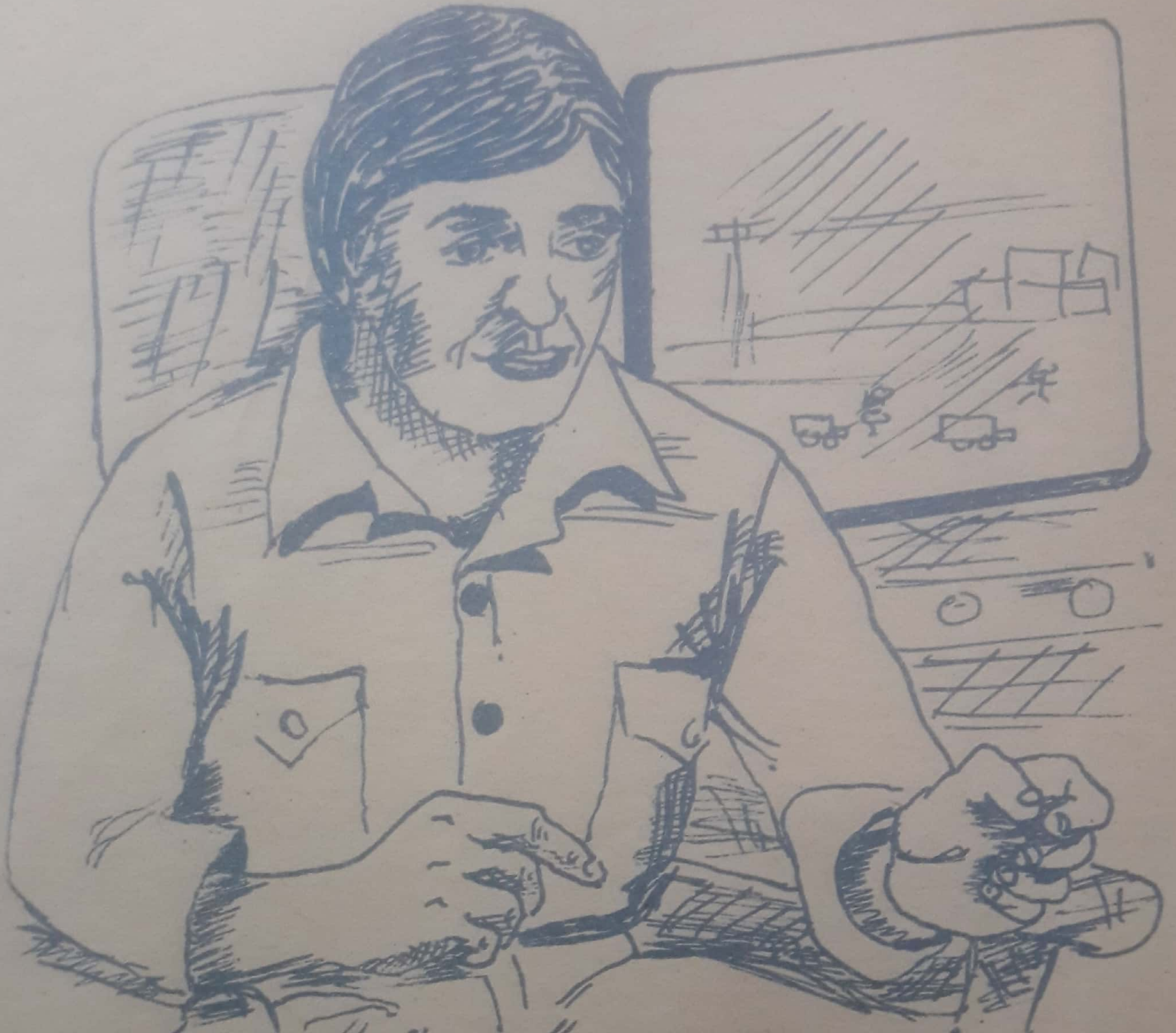
1 وہ کون سی چیز ہے جو وزن رکھتی ہے مگر نظر نہیں آتی؟
2 وہ کون سی شے ہے جو نظر آتی ہے مگر وزن نہیں رکھتی؟
3 وہ کون سی چیز ہے جس کی رفتار کو راکٹ جیسی چیز بھی نہیں پہنچ سکتی؟
4 وہ کون سی نماز ہے جو رکوع و سجود کے بغیر ادا کی جاتی ہے؟
5 وہ کون سی چیز ہے جو نظر نہیں آتی مگر محسوس ہوتی ہے؟
6 وہ کون سی بیل ہے جس کے نہ پتے ہیں اور نہ زمین میں بوئی جاتی ہے؟
7 بوجھ اُٹھانے والا وہ کون سا جانور ہے جس کے ماں، باپ، بچے تینوں کی نسل مختلف ہوتی ہے؟
8 وہ کون سا جزیرہ ہے جس کا نام ایک پھل کے نام پر ہے؟
9 وہ کون سی اذان ہے جس کے ساتھ نماز نہیں ہوتی؟
10 وہ کون سا ملک ہے جس کا نام ایک پرندے کے نام پر ہے؟



جوابات: (1) ہوا (2) سایہ (3) دلیل
(4) نماز جنازہ (5) خوشبو (6) آکاش بیل
(7) خچر (8) مالٹا
(9) بچے کی پیدائش کے وقت (10) پیرو

آصف ملک

دو ڈاکٹر



جہاز کے اُڑنے میں صرف آدھا گھنٹا باقی رہ گیا تھا۔ ڈاکٹر اِقبال ایک نشست پر بیٹھے کسی گہری سوچ میں غرق تھے۔ انھیں اپنا ماضی یاد آرہا تھا۔ جب وہ سولہ برس کے تھے اور ڈاکٹر اقبال کے بجائے صرف اِقبال تھے۔

اقبال کے والد تو بچپن ہی میں انتقال کر گئے تھے۔ بس ایک ماں تھی جسے حالات نے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔ اُن کے بالوں

سے چاندنی چھلکنے لگی تھی اور چہرے پر جھریاں پڑتی جا رہی تھیں۔ اقبال کی امی نے اسے میٹرک تو کرا دیا تھا۔ مگر اب ان میں اتنی سکت نہ تھی کہ بیٹے کو آگے پڑھا سکیں۔ کیوں کہ دن رات کی محنت سے ان کی صحت خراب ہو گئی تھی اور وہ سرطان جیسے مہلک مرض میں مبتلا ہو گئی تھیں۔

اقبال کو وہ طوفانی رات اب تک یاد تھی۔ جب موسلا دھار بارش اور سرد ہوا کے تھپیڑوں نے ایک خوف ناک منظر پیدا کر دیا تھا اور ایسے وقت میں اقبال کی امی کی طبیعت نہایت خراب ہو گئی تھی اور اتنی رات گئے تمام کلینک بھی بند ہو گئے تھے۔ وہ اپنی امی کو دلاسا دے رہے تھے کہ امی آپ فکر نہ کریں۔ آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔ مگر وہ تو زندگی سے بالکل مایوس ہو چکی تھیں۔

لیکن اقبال کے دل میں ابھی امید کی ایک کرن روشن تھی اور یہی وجہ تھی کہ وہ اتنے زبردست طوفان میں بھی محلے کے ڈاکٹر ظہیر کے گھر تک چلے گئے۔ دستک دینے پر ڈاکٹر ظہیر خود باہر آئے۔

"بھئی! تم کون ہو؟ اور اتنے تیز طوفان میں کیوں آئے ہو؟" ڈاکٹر ظہیر نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب! میں آپ ہی کے محلے میں رہتا ہوں۔ آپ کو اس وقت اس لیے تکلیف دی ہے کہ میری امی بہت بیمار ہیں۔ اگر آپ اس وقت ذرا سی تکلیف گوارا کر کے میری امی کا معائنہ کر لیں تو میں آپ کا بہت شکر گزار رہوں گا۔" اقبال نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"میاں! تمھارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اس وقت میں تمھارے ساتھ قطعی نہیں جا سکتا اور پھر تمھارے پاس تو میری فیس کے پیسے بھی نہیں ہوں گے۔ اونہہ! نہ جانے کہاں سے آ جاتے ہیں۔" ڈاکٹر ظہیر نے اقبال کے معمولی کپڑوں کو دیکھتے ہوئے کہا اور دروازہ بند کر کے اندر چلے گئے۔

اقبال، ڈاکٹر ظہیر کی بے حسی پر افسوس کرتا ہوا ناکام و نامراد واپس

گھر کی طرف ہو لیا۔

مگر جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوا اس پر ایک قیامت سی ٹوٹ پڑی۔ کیوں کہ اقبال کی امّی اب اس دُنیا میں نہیں رہی تھیں۔ وہ رات بھر اپنی امّی کی نعش سے لپٹ کر روتا رہا۔ صبح انھیں دفنا دیا گیا۔

اب اقبال نے ایک عزم کر لیا کہ وہ اپنی لگاتار محنت سے ڈاکٹر ضرور بنے گا مگر ڈاکٹر ظہیر جیسا بے حس ڈاکٹر نہیں بلکہ غریبوں سے ہمدردی رکھنے والا۔ تاکہ آیندہ کسی غریب اقبال کی امّی بر وقت طبی امداد نہ پہنچنے کے باعث موت کے منھ میں نہ چلی جائے۔

پھر اقبال نے ایک کالج میں داخلہ لے کر وظیفہ حاصل کر لیا اور ایک ٹائپسٹ کی جز وقتی ملازمت کر لی۔ کیوں کہ اسے ٹائپ بھی آتی تھی۔ اور یوں اقبال نے خُدا کے سہارے اور اپنی لگاتار محنت سے اپنی منزل حاصل کر لی۔ وہ اپنی اعلیٰ کارکردگی کی بنا پر ہر سال اسکالرشپ حاصل کرتا رہا اور بالآخر وہ ایک دن ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی ڈگری حاصل کر کے ڈاکٹر بن چکا تھا۔ پھر



اس نے پریکٹس شروع کر دی۔

ڈاکٹر اقبال اب بھی اپنا عزم نہیں بھولے تھے۔ اسی لیے انھوں نے شہر کے بجائے ایک گاؤں میں جا کر کلینک کھولا اور وہاں غریبوں کا معمولی فیس پر علاج کر کے اپنے عزم کی تکمیل کرنے لگے۔ مگر اس دوران انھوں نے چند دوستوں کے مشورے پر ایک خاتون صوفیہ سے شادی کر لی۔ چونکہ صوفیہ کو گاؤں پسند نہ تھا، اس لیے وہ شہر ہی میں رہتی اور ڈاکٹر اقبال ہر چھ ماہ بعد اپنی بیوی سے ملنے شہر آتے رہتے۔

پھر ایک دن ان کے گھر میں ایک خوب صورت بچہ پیدا ہوا۔ جس کا نام ٹونی رکھا گیا۔

وقت گزرتا گیا اور ٹونی پانچ برس کا ہو گیا۔ مگر اب وہ عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گئے تھے۔ کیوں کہ ٹونی ان سے کہتا تھا "ڈیڈی! آخر ہمارے پاس کار کیوں نہیں ہے۔ ہم اس چھوٹے سے مکان میں کیوں رہتے ہیں۔ ہمارا بڑا سا بنگلہ کیوں نہیں ہے؟ ہمارے گھر میں رنگین ٹیلیویژن کیوں نہیں ہے۔ میرے جتنے دوستوں کے ڈیڈی ڈاکٹر ہیں۔ ان کے پاس تو یہ سب چیزیں موجود ہیں۔"

"بیٹے! آپ کے دوستوں کے ڈیڈی جو ڈاکٹر ہیں، وہ امیروں کے ڈاکٹر ہیں، اس لیے وہ امیر ہیں اور میں تو غریبوں کا ڈاکٹر ہوں اس لیے میں غریب ہوں۔" ڈاکٹر اقبال نے ٹونی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"مگر ڈیڈی آپ امیروں کے ڈاکٹر کیوں نہیں بن جاتے" ٹونی بولا۔

"بیٹے! اگر سارے ڈاکٹر امیروں کے ڈاکٹر بن جائیں تو غریبوں کا ڈاکٹر کون بنے گا۔ ان کا علاج کون کرے گا؟" ڈاکٹر اقبال نے مزید سمجھایا۔ کیوں کہ ان میں واقعی اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنے بیٹے کی خواہش پوری کرنے کے لیے ایک گاؤں کے چھوٹے سے کلینک کے ذریعے اتنا روپیہ کما سکتے۔

اور اب تو صوفیہ نے بھی ناگواری کا اظہار کرنا شروع کر دیا تھا۔

"تم تو ڈاکٹر بھی بالکل فضول بنے۔ تمھیں میری خواہش کا ذرا احساس نہیں ہے"
صوفیہ ناگواری سے کہتی۔
اب ڈاکٹر اقبال کے دوستوں نے انھیں مشورہ دینا شروع کر دیا تھا کہ وہ امریکا چلے جائیں۔ کیوں کہ امریکا میں انھیں ڈھیر سارا روپیہ کمانے کا موقع مل جائے گا۔
"دیکھو اقبال! اگر تم امریکا چلے گئے تو اپنے بیٹے اور بیوی کی ساری خواہشات پوری کر سکو گے۔ آخر تم کب تک غریبوں کا درد اپنے دل میں لیے پھرو گے" ایک دفعہ ان کے دوست امتیاز نے کہا۔
پہلے تو ڈاکٹر اقبال انکار کرتے رہے مگر بالآخر انھیں مجبور ہونا ہی پڑا اور اس وقت وہ ائرپورٹ کے ویٹنگ روم میں بیٹھے اپنی پرواز کا انتظار کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ امریکا چلے جائیں گے۔ انھوں نے سوچا۔



اس وقت ڈاکٹر اقبال نہ جانے کیوں ایک عجیب سی بے چینی محسوس کر رہے تھے وہ امریکا جانے میں نہ جانے کیوں خوشی محسوس کر رہے تھے وہ کچھ اداس سے ہو گئے.... پھر.... انھوں نے تصور میں دیکھا کہ

نجانے کتنے غریب مریض بے حس ڈاکٹروں کے آگے پیچھے پھر رہے ہیں
اُن کی خوشامد کر رہے ہیں کہ وہ انہیں دوا دے دیں مگر وہ بھاری فیس
دے سکنے کے باعث دوا سے محروم رہے ہیں اور نجانے کتنے غریب
بیمار بے بسی کی موت مر رہے ہیں۔ محض اس وجہ سے کہ اُن کے پاس دوا کے
پیسے نہیں ہیں۔

"نہیں نہیں ... میں امریکا نہیں جاؤں گا۔ میں محض اپنے بیوی ا
بچے کی خواہشات کی وجہ سے بہت سے غریبوں کو بے بسی کی موت نہیں م
دوں گا۔ نہیں میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔" ڈاکٹر اقبال نے اپنے دل
میں سوچا۔

اور پھر وہ اپنی نشست منسوخ کرا کے اپنے عزم کی تکمیل کے لیے
گھر کو واپس آ گئے۔

وقت :

- وقت ضائع کرتے وقت یہ یاد رکھیے کہ وقت بھی آپ کو ضائع کر رہا ہے۔
- وقت ایک ایسی زمین ہے جس میں محنت کے بغیر کچھ پیدا نہیں ہوتا۔
- وقت کے پاؤں کی آہٹ سُنی نہیں جاتی۔
- وقت زندگی کا تانا بانا ہے۔ اگر بچپن کی دوڑ بھاگ میں اسے توڑ ڈالو گے تو پھر عُمر بھر نہ جوڑ سکو گے۔
- وقت گزر جانے پر افسوس بے نتیجہ ہے۔

(توصیف احمد۔ لاہور)



مجھے اب تک یاد ہے!

یہ قصہ ہے اس روز کا جب شامت پوری رفتار سے ہمارا پیچھا کر رہی تھی۔ ہوا یوں کہ ہمارے کالج بند ہو گئے بالکل اچانک ہمیں بتائے بغیر۔ کالج بند ہونے کا سُن کر ایک طرف تو خوشی سے ہماری باچھیں کھل گئیں لیکن دوسری طرف ہمیں دکھ بھی ہوا۔ کیوں کہ چھٹیوں میں اکثر ہماری شامت آئی رہتی تھی۔ اس لیے اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کے لیے ہم نے کچھ پروگرام بنا لیے اور اپنے آپ سے وعدہ کیا کہ کسی سے بھی اُونچی نیچی بات نہیں کریں گے اور زیادہ تر خاموش رہیں گے۔ کیوں کہ ہم نے سُن رکھا ہے کہ ایک چُپ، سو سُکھ۔ ہم نے بزرگوں کی اس بات پر سختی سے کاربند رہنے کا فیصلہ کر لیا۔

جس دن کا قصہ سُنانے لگی ہوں۔ اس دن رات کو ہمیں ایک نہایت بُرا خواب آیا۔ کہ ہماری پٹائی ہو رہی ہے۔ یہ خواب دیکھ کر ہمارے اوسان خطا ہو گئے۔ ہم نے اس خواب کا اثر زائل کرنے کے لیے فجر کی نماز پڑھ کر اپنے لیے خصوصی دعائیں مانگیں۔ ابھی سُورج نکلنے میں کافی دیر تھی۔ اس لیے ہم نے سوچا کہ کچھ دیر سو جانا چاہیے۔

یہ سوچ کر ہم ایک کمرے کی طرف بڑھے۔ اندھیرا گہرا تھا اس لیے ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھنے لگے کہ اچانک ایک زور دار دھماکا ہوا اور پھر چھناکے کی آواز سنائی دی۔ ہم نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ یہاں ایک بات کی وضاحت کرتی چلوں کہ آنکھیں بند کر کے چلنا ہمیں بہت پسند ہے اور ہماری عادت بن چکا ہے۔ ہم نے جب آنکھیں کھول کر اردگرد نگاہ دوڑائی تو ہم پر یہ راز کھلا کہ رات کو آپی نے جو برتن میز پر رکھ دیے تھے، وہ سب اتفاق کی برکت کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اکٹھے گرے اور چکنا چور ہو گئے ہیں۔ یہ دیکھ کر ہم نے اس کمرے سے بھاگ جانے ہی میں عافیت سمجھی اور دوسرے کمرے میں جا کر سو گئے۔

تھوڑی دیر بعد ہمارے چھوٹے بھائی نومی کا جس نے آکر ہمیں میٹھی نیند سے جگا دیا اور اپنی کوّے جیسی "سُریلی" آواز میں ہم سے اپنی پنسل مانگی اور ساتھ ہی امی جان کا نادر شاہی حکم بھی سُنا دیا کہ آ کر ناشتہ کرو۔

امی جان کا حکم سنتے ہی ہم کسی کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح بھاگے اور میز کے گرد جا کر بیٹھ گئے۔ آپی نے جب دیکھا کہ ہم ہاتھ منھ دھوئے بغیر ناشتہ کرنے آموجود ہوئے ہیں تو پہلے ان کے ماتھے پر ایک تیوری پڑی۔ جس کا مطلب ہم نہ جان سکے۔ پھر انھوں نے اپنے ماتھے پر جب دوسری، تیسری اور چوتھی تیوری ڈالی اور ساتھ ہی گھور گھور کر ہمیں دیکھنا شروع کر دیا تو ہم کو مجبوراً اُٹھنا پڑا۔ ہم کم عقل ضرور ہیں لیکن اتنے بھی نہیں کہ ان کی بات نہ سمجھ سکتے۔ جب ہم نے ان کی لال لال آنکھوں کی طرف دیکھا تو جلدی سے اُٹھے اور عادت کے مطابق آنکھیں بند کر کے غسل خانے کی طرف بھاگے لیکن شامت ہمارا پورا پورا پیچھا کر رہی تھی۔ عین اسی وقت امّی جان جو بھائی کے لیے دُودھ لا رہی تھیں، ہم زور سے ان سے جا ٹکرائے اور آنکھیں کھول کر جو دیکھا تو زمین و آسمان گھومتے ہوئے نظر آئے۔ کیوں کہ دُودھ گر چکا تھا اور گلاس ہمارے جلوے کی تاب نہ لا سکا اور سجدے میں گر کر چکنا چُور ہو گیا تھا۔

یہ دیکھ کر ہم توپ سے نکلے ہوئے گولے کی رفتار سے زن سے وہاں سے بھاگے۔ ایک زوردار دھماکے کی آواز پر ہم آنکھیں کھولنے پر مجبور ہو گئے لیکن آنکھیں کھولنے تک ٹی۔وی سیٹ ہم پر گر چکا تھا اور سکرین ٹوٹ کر ہمارے قدم چوم رہی تھی۔

اُدھر امّی جان اس کمرے میں جا پہنچیں جہاں ہمارے ساتھ پہلے حادثہ ہو چکا تھا۔ انھوں نے جب چینی کے سیٹ کو ٹوٹے دیکھا تو ہمیں تلاش کرتے ہوئے اس کمرے میں آ پہنچیں جہاں ہم پڑے تھے۔

جب انھوں نے ٹی وی سیٹ کی سکرین بھی ٹوٹی پائی تو بس جناب! ان کا پارہ ایک سو بیس درجے پر جا پہنچا۔ اب ہماری شامت یقینی تھی۔ کیوں کہ شام کو ٹی وی پر امّی جان کا پسندیدہ ڈرامہ آنا تھا۔

اس کے بعد جو ہمارا حشر ہوا وہ اشاعت کے قابل نہیں۔ کیوں جان کر اور شرمندہ کرتے ہیں۔ لیکن اس حشر کے بعد ہماری ایک پیاری عادت ہم سے ہمیشہ کے لیے روٹھ گئی تھی یعنی آنکھیں بند کر کے چلنے کی عادت۔

(راحت خوشنود۔ لاہور)

میں رات کے وقت اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ سحری کے وقت میری آنکھ کھُلی۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو فجر کی نماز کا وقت تھا۔ میں فوراً اُٹھا اور نماز پڑھنے کے لیے وضو کرنے باہر نکلا۔ ابھی جوتا پہن کر دروازے سے باہر نکلا ہی تھا کہ میرے کمرے کا شہتیر ٹوٹا اور کمرے کی چھت نیچے گر پڑی اور اس طرح ذرا سی کوتاہی نہ کرنے سے میں موت کے مُنھ سے بچ گیا۔ اب میں سوچتا ہوں کہ اگر میں تھوڑی سی کوتاہی کرتا تو میں آج جانے کس جگہ ہوتا۔

(اسلم شہزاد۔ سیالکوٹ)

یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب ہمیں گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں۔ بس پھر

ہم تھے اور ہمارا لٹو کھیلنا تھا لیکن لٹو کھیل کھیل کر ہم جلد ہی اکتا گئے
ان دنوں ہمارے بھائی جان بھی گھر پر تھے اور وہ بھی شاید گھر میں پڑے
پڑے بور ہو رہے تھے۔ چنانچہ انھوں نے سیالکوٹ جانے کا ارادہ فرمایا۔ ابّو
سے اپنے ارادے کا ذکر کیا تو وہ کہنے لگے :
"بیٹے! چند ماہ بعد تمھارے امتحانات ہونے کو ہیں تم گھر پر پڑھا کرو
اور سیالکوٹ جانے کا ارادہ ترک کر دو"
لیکن بھائی جان بھلا کب ماننے والے تھے۔ خیر جی ہم بھی ان کی حمایت
میں کھڑے ہو گئے تاکہ اگر بھائی جان کو جانے کی اجازت مل گئی تو وہ ہمیں
بھی اپنے ساتھ لے چلیں۔
خیر بڑی مشکل سے ابّو رضامند ہوئے لیکن امّی نہ مانیں۔ ہم خاصے پریشان
ہوئے لیکن ہم نے امّی کی ایک نہ سُنی۔ اور مقررہ دن تیار ہو کر چل دیے۔ پنڈی
کی بس بڑی مشکل سے پکڑی۔ بھائی جان کا تو پتا نہیں لیکن پھر بھی ہمیں یقین
تھا کہ وہ بھی سیٹ حاصل کر چکے ہوں گے۔ ہمیں ایک خاتون کے ساتھ جگہ
مل گئی۔

ابھی پنڈی کے اڈے تک کوئی 30 میل کا فاصلہ ہوگا کہ اچانک بس
رُکی۔ کنڈیکٹر پنڈی والا، پنڈی والا کی رٹ لگا رہا تھا۔ ہم سمجھے شاید پنڈی کا
بس سٹاپ آگیا ہے اور بھائی جان بھی اُتر چکے ہیں۔
ہم جلدی سے بس سے نیچے اُترنے لگے کہ پیچھے سے بھائی جان چلّائے
کہ کہاں جا رہی ہے ابھی تو پنڈی نہیں آیا۔ ہم نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو ساری
بس ہماری طرف متوجہ تھی۔ ہمیں سخت شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا اور چُپ چاپ
اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ باقی سفر خیریت سے گزرا۔ ہم سمجھ گئے کہ یہ ماں کو
ناراض کرنے کی سزا تھی اس لیے اب ہم کوشش کرتے ہیں کہ ماں ہم سے
ناراض نہ ہو۔ آج بھی جب یہ واقعہ یاد آتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اگر
ہم وہاں اُتر جاتے تو۔ ۔ ۔ ۔

(روبینہ جبین۔ صوابی)

خیال اپنا اپنا



اگر انسان کی تین آنکھیں ہوتیں تو تیسری آنکھ سر کے پچھلی طرف ہونی چاہیے تھی تاکہ انسان بیک وقت آگے اور پیچھے دونوں طرف دیکھ سکتے۔

(محمد انعام الحق، جہلم)

اگر خدا انسان کو تین آنکھوں سے نوازتا تو تیسری آنکھ میرے خیال میں پیچھے سر پر ہونی چاہیے تھی۔ کیوں کہ اس طرح انسان کو آگے پیچھے دونوں طرف نظر آتا اور آرام سے مڑتے بغیر دونوں طرف دیکھنا۔

(عالیہ معین)

اگر انسان کی تین آنکھیں ہوتیں تو تیسری آنکھ سر کے پچھلی طرف کو ہونی چاہیے تھی۔ وہ اس لیے کہ مسجد میں نماز پڑھتے وقت تیسری آنکھ پیچھے سے جوتوں کی نگرانی کرتی رہتی۔ کیوں کہ آج کل مسجدوں سے جوتے چرانے والوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

(عبدالرحمٰن بانی، جھنگ)

اگر انسان کی تین آنکھیں ہوتیں تو تیسری آنکھ انگلی کے سرے پر ہونی چاہیے تھی اور وہ اس لیے کہ اس کی مدد سے انسان آئینے کے بغیر

اپنے جسم کے ہر حصّے کو بآسانی دیکھ سکتا ہے۔ (اظہر ریاض، لاہور)

اُف توبہ یہ کیسا موضوع ہے۔ پڑھتے ہی جھرجھری سی آتی ہے۔ انسان کتنا بھیانک لگے اگر اس کی تین آنکھیں ہوں۔ بہرحال اگر آپ انسان کی تین آنکھیں کرنے پر مُصر ہیں تو ہمارے خیال میں تیسری آنکھ ہماری موجودہ دو آنکھوں کے عین پیچھے سر میں ہونی چاہیے تھی۔ اس سے ہمیں کچھ تو فائدہ ہوتا ہم اپنے پیچھے کی بھی چیزیں دیکھ سکتے اور ہماری نظر کا دائرہ وسیع ہو جاتا۔

(شہناز فاطمہ۔ اسلام آباد)

میرے خیال میں انسان کی تیسری آنکھ پیچھے سر پر ہونی چاہیے تھی تاکہ وہ بیک وقت دو طرف دیکھ سکتا۔ اس طرح ٹریفک کے حادثات کم ہو سکتے تھے۔

(پاکیزہ یوسف۔ راولپنڈی)

تیسری آنکھ دائیں ہاتھ کی بڑی انگلی پر ہونی چاہیے تھی کہ جیب میں اگر بہت سے پیسے ہوں تو صرف دو انگلیاں ڈال کر اپنی ضرورت کا سکّہ نکال لیتے۔

(محمد سعید تاج، کراچی)

مختلف دوستوں کے مختلف خیالات ہوں گے مگر میرے خیال میں انسان کی تین آنکھیں ہوتیں تو تیسری آنکھ پیچھے ہونی چاہیے تھی تاکہ انسان اپنے ان دوست نما دشمنوں کو دیکھ سکے جو اس کے پیچھے اس کی برائیاں کرتے ہیں۔

(سلیم سوتی۔ کراچی)

اگر انسان کی تین آنکھیں ہوتیں تو انسان بھی عجیب ہی ہوتا۔ اگر انسان کی تیسری آنکھ ہوتی تو ماتھے پر ہونی چاہیے تھی یا پھر سر کے پیچھے۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا کہ انسان پیچھے دیکھ سکتا۔ (راجا نوید اللہ۔ گھنسنگال کلر سیداں)

تیسری آنکھ پیچھے سر پر ہونی چاہیے تھی۔ تاکہ انسان اپنے پیچھے ہونے والے واقعات سے بھی باخبر رہتا اور ٹریفک کے حادثات بھی کم ہوتے۔

(مقبول امتیاز۔ لاہور)

لو ہنس دیے



اُستاد : (شاگرد سے) غالب کا خط میر مہدی کے نام پڑھو ؟
شاگرد : جی میں نہیں پڑھوں گا ۔
اُستاد : کیوں ؟
شاگرد : آپ ہی نے تو بتایا تھا کہ دوسروں کے خط نہیں پڑھا کرتے ۔

(محمد علی جہانگیر ۔ کراچی)

ایک دوست نے دوسرے دوست سے پوچھا :
"یار تمھاری کیسی عادت ہے کہ ہر بات کا جواب سوال کی شکل میں دیتے ہو ؟"
دوست بولا : "اچھا ! کیا واقعی ؟" (عبدالماجد، کراچی)

اُستاد : آب آب ہونا کو جملے میں استعمال کرو ؟
شاگرد : پچھلے سال ہمارے گاؤں میں سیلاب آیا اور وہ آب آب ہو گیا ۔

گاہک : جناب میرا سونے کا سیٹ کب تک بن جائے گا؟
سنار : جناب جب تک باہر سے پیتل نہیں آجاتا میں کچھ نہیں کر سکتا۔
(شاہد اقبال، گوجرانوالہ)

ایک آدمی جو ہکلاتا تھا، ایک دکان سے طوطا خریدنے گیا اور کہنے لگا:
"م ... م ... مجھے ... ایک ... اچھا ... سا ... ب .. ب ... بولنے والا ... ط .. ط ... طوطا ... دے ... دیجیے۔"
دکان دار نے سر پیٹ لیا اور کہا "خدا کے لیے تشریف لے جائیے آپ میرے طوطوں کی زبان خراب کر دیں گے۔"
(محمد افضل، لاہور)

شوہر نے اپنی بیوی کو خط لکھا۔ جب بیوی نے اس کی لکھائی دیکھی تو اسے ایک حرف بھی سمجھ میں نہ آیا۔ ساتھ ہی دوا فروش کی دکان تھی۔ وہ خط اس کے پاس لے گئی اور کہا کہ اسے پڑھ دے۔
دوا فروش بڑی دیر تک غور کرنے کے بعد بولا: میں ابھی حاضر ہوا اور اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اندر سے کچھ دوائیں لے کر آیا اور اس عورت کو دیتے ہوئے بولا: گیارہ روپے، پچاس پیسے۔
(شمائلہ گیلانی، لاہور)

باپ : احمد! تمھارے اُستاد صاحب کیسا پڑھاتے ہیں؟
احمد : پڑھاتے تو اچھا ہیں لیکن آج میں نے جب ان سے "آئی ڈونٹ نو" کا مطلب پوچھا تو بولے، مجھے معلوم نہیں۔
(توصیف صداقت، ملتان)

ایک رات کسی گھر میں چور گھس آئے۔ اس گھر کا سارا سامان انھوں نے اٹھا لیا۔ اتنے میں دونوں میاں بیوی کی آنکھ کھل گئی تو وہ چور چور کا شور مچانے لگے۔ چوروں نے انھیں خوب پیٹا اور بھاگ گئے۔
صبح جب تفتیش شروع ہوئی تو تھانے دار نے پوچھا "جب تمھاری چوری ہوئی تھی اس وقت کتنے بجے تھے"
وہ آدمی بولا "جی چار ڈنڈے مجھے اور دو میری بیوی کو۔"
(عبدالرحمٰن عارف، جوڑہ کلاں)

اُستاد: بتاؤ وہ کون سا طریقہ ہے جس سے سوال جلدی حل ہو جاتے ہیں؟
شاگرد: (معصومیت سے) جناب نقل کرنے سے۔
(عابد ضیا، گوجرانوالہ)

ایک ہوٹل میں بہت خراب کھانا پکتا تھا۔ ایک گاہک نے مینجر سے شکایت کرنی چاہی۔ اس آدمی نے بیرے کو بلا کر پوچھا۔ تمھارا مینجر کہاں ہے؟
بیرے نے کہا "جناب! وہ دوسرے ہوٹل میں ناشتہ کرنے گئے ہیں۔"
(راشد قمر، فیصل آباد)

ایک دوست نے دوسرے دوست سے پوچھا: بتاؤ گدھا گاڑی اور کار میں کیا فرق ہوتا ہے؟
دوست نے ذرا سوچ کر کہا: گدھا گاڑی میں گدھا باہر ہوتا ہے۔ اور کار میں اندر۔
(شہزادہ سلیم، لطیف آباد)



دل چسپ اور عجیب

سب سے بڑی موم بتی :

جرمنی کے ایک گرجا گھر میں سالانہ مذہبی جشن کے موقع پر ایک موم بتی لائی گئی جس کا وزن 35 پونڈ تھا اور لمبائی 42 فٹ۔ یہ موم بتی گرجے میں سارا سال جلتی رہی۔ (فضل فولادی۔ کوئٹہ)

بے کان آدمی :

پولینڈ کا ایک شخص الفل الوان قدرتی طور پر بغیر کانوں کے پیدا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کی ہر چیز درست تھی لیکن کان غائب تھے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ کانوں کے سوراخ بھی نہیں ہیں۔

خوں خوار عورت :

مفرٹ کوخ دنیا کی خوں خوار عورت تھی۔ اُس کی وحشت کا یہ عالم تھا

کہ وہ انسان کی کھال کا لباس پہنتی اور زندہ انسان کی کھال صرف 20 منٹ میں جسم سے علیحدہ کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

(عبدُالرحمان مانی ۔ جھنگ)

عجیب محل :

کوبرا اٹلی میں ایک ایسا محل ہے۔ جس میں دن کے وقت اگر کوئی آواز لگائے تو اس کی آواز دوبارہ گیارہ مرتبہ اور رات کو بارہ مرتبہ سُنائی دے گی۔

صرف ایک آدمی :

کیلی فورنیا کے سموئیل رینڈر ولف ڈوائے کراس نامی ایک شخص بیک وقت ڈاکیہ، وکیل، انشورنس ایجنٹ، برف، کوئلہ اور دالوں کا بیوپاری، ایک اصطبل کا مالک، ایمپلائمنٹ ایجنٹ، پولیس والا، اخباری رپورٹر اور گاڑی بان کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔

انوکھی ہڑتال :

ہڑتالیں تو بہت دیکھی ہیں لیکن دنیا میں سب سے پہلی ہڑتال جو ہوئی وہ فرعون کے مزدوروں نے کی۔ جن کا مطالبہ غذا میں پیاز کو شامل کرنا تھا۔ یہ ہڑتال سب سے انوکھی ہڑتال رہی۔

نئی ایجاد :

امریکا میں ایک ایسا تنور تیار کیا گیا ہے جو کھانا پکانے والے انسان

سے انسانی آواز میں باتیں کرتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ کس درجۂ حرارت پر کھانا پکے گا۔ کتنا وقت لگے گا اور جب کھانا پک کر تیار ہو جائے تو کہتا ہے "کھانا پک گیا ہے"۔ یہ تنور ابھی نمونے کے لیے تیار کیا گیا ہے اور ابھی آزمائش کے مرحلے میں ہے۔ (فوزیہ رفیق)

سب سے گہرا مقام:

دنیا کا سب سے گہرا مقام ماریانا ٹرینچ ہے۔ یہ بحرالکاہل میں واقع ہے۔ یہ مقام 35760 فٹ یا ساڑھے چھ میل سے بھی زیادہ گہرا ہے۔ یعنی یہ اتنا گہرا ہے کہ یہاں دُنیا کی بلند ترین چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ بھی غرق ہو جائے۔ (محمد مسعود لودھی۔ کراچی)

مچھلی پکڑنے کا عجیب طریقہ:

سوویٹ سائنس دانوں نے مچھلی پکڑنے کا ایک نیا طریقہ معلوم کیا ہے۔ سمندر میں بجلی کے لیمپ کے ساتھ گاؤدم شکل کا ایک جال ڈالا جاتا ہے۔ دو تین منٹ کے بعد اس لیمپ کے گرد مچھلیاں اکٹھی ہو جاتی ہیں۔ اور جال مچھلیوں سے بھر جاتا ہے۔ (سیّد عابد علی شاہ۔ موج دریا)

عجیب گائے:

امریکا میں ایک ایسی گائے موجود ہے۔ جس کے پیٹ پر قدرتی طور پر ICE (آئس، جس کے معنی ہیں برف) لکھا ہوا ہے۔
(امیر عمر اعوان۔ سرگودھا)

آپ بھی پوچھیے؟



س : تعلیم و تربیت پہلی بار کب جاری ہوا تھا؟ (عمران شمیم، کراچی)

ج : آج سے اکتالیس برس پہلے۔

س : اگر اس دنیا میں سب انسان ایک جیسے ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا؟ (محمد علی چنگیزی، کوئٹہ)

ج : اگر سب انسان ایک جیسے ہوتے تو ہمارے خیال میں یہ دنیا بڑی "بور" ہوتی۔ اصل میں سب رونق رنگا رنگی کی وجہ سے ہے۔

س : کیا آپ سے اکتوبر 1978 کا تعلیم و تربیت مل سکتا ہے؟ (نجیب علی خان)

ج : صاحب ہمارے پاس تو بعض تازہ پرچے بھی نہیں بچتے آپ اکتوبر 1978 کی بات کرتے ہیں۔

س : آپ میرے مضمونوں کے ساتھ سوتیلی ماں کا سا سلوک کیوں کرتے ہیں؟ (عبدالرحمٰن مانی، جھنگ)

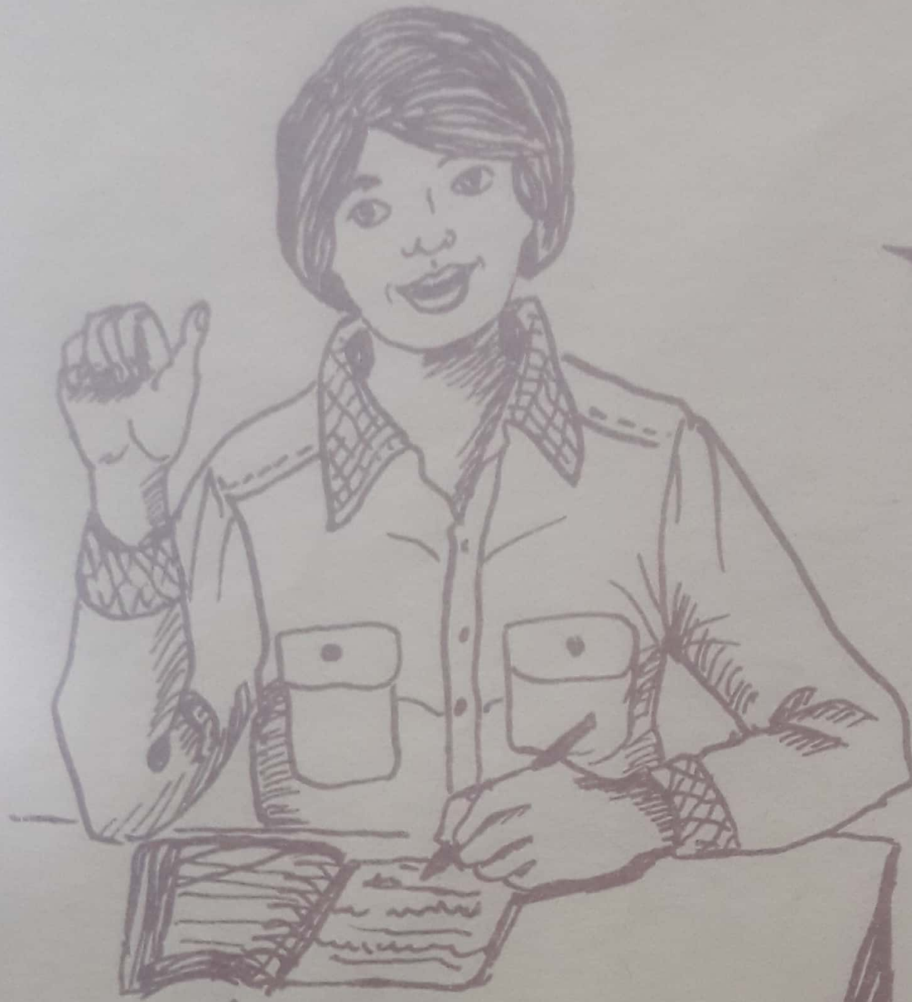
ج : صاحب قسم لے لیجیے اگر ہم کسی کا نام دیکھ کر اس کا مضمون چھاپتے ہوں۔ ہم مضمون نگار کو نہیں مضمون کو دیکھتے ہیں۔

س : علامہ اقبال نے بچوں کے لیے کتنی نظمیں لکھی ہیں؟ (مجسّم زرخیز، سیالکوٹ)

ج : بہت کم۔ یہی کوئی آٹھ دس اور بس۔

س : سرورق پر تصویر چھپوانے کا طریقہ کیا ہے؟ (عبّاس چودھری، لاہور)
ج : تصویر سرورق کے قابل ہو تو ہمارے پتے پر بھیج دیجیے۔
س : سعید لخت صاحب آج کل کہاں غائب ہیں؟ (محمد اسلم زلفی، لاہور)
ج : وہ آپ کے لیے کتابیں لکھنے میں مصروف ہیں۔
س : آپ کا پسندیدہ شعر کون سا ہے؟
ج : تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا
کیسی زمیں بنائی، کیا آسماں بنایا
س : سرورق کے لیے رنگین تصویر بھجوانا کافی ہے یا ٹرانسپیرنسی ضروری ہے؟ (عزیز انصاری، فیصل آباد)
ج : رنگین تصویر کافی ہے۔ ٹرانسپیرنسی ہو تو بہتر ہے۔
س : آپ ایک سوال کا جواب کتنے ماہ بعد دیتے ہیں؟
(کاشف نثار، کراچی)
ج : اسی وقت البتّہ وہ چھپ کر دیر کے بعد آپ کے سامنے آتا ہے۔
س : کیا آپ ادیبوں اور شاعروں کے تعارف کا سلسلہ دوبارہ شروع کر سکتے ہیں؟ (راشد قمر، فیصل آباد)
ج : ہاں! کیوں نہیں۔
س : میں سالانہ خریدار بننا چاہتی ہوں۔ کیا طریقہ اختیار کروں؟
(نبیلہ زبیری، لاہور)
ج : آپ سالانہ قیمت منی آرڈر کے ذریعے سے بھیج سکتی ہیں۔
س : اگر میں اپنی ننھی بہن کی تصویر بھیجوں تو آپ چھاپ دیں گے؟
(رُخسانہ عبدالقدیر، حیدر آباد)
ج : جی ہاں، ضرور انشاءاللہ!
س : صحت کے لیے سب سے مفید کیا ہے؟ (اظہر ریاض، لاہور)
ج : خوش رہنا۔

ہونہار ادیب



نشانہ بازی

محمد عزیز (شیخوپورہ)

گرمیوں کی چھٹیوں میں جب خالہ جان پنڈی سے تشریف لائیں تو ان کے ساتھ ہمارا کزن شاہد بھی تھا جسے دیکھ کر ہمارا دل باغ باغ ہو گیا۔ بات دراصل یہ تھی کہ سکول کا کام تو ہم نے ایک دو ہفتے ہی میں ختم کر لیا تھا اور اب کوئی کام کرنے کو نہ تھا۔ اس لیے ہم ان دنوں بہت بور ہو گئے تھے۔ شاہد کو دیکھا تو سوچا کہ کچھ بوریت دُور ہو گی۔ اب ہم دونوں مل کر نت نئی شرارتیں کرتے۔ کسی کسی دن ابو جان کا جوتا ہماری خاطر بھی کرتا، لیکن ہم اس خاطر کو کسی خاطر میں نہ لاتے اور آئندہ شرارتوں کے لیے پروگرام تیار کرتے رہتے۔

یہ ایک منحوس شام کا ذکر ہے کہ ہم نے نشانہ بازی کا پروگرام بنایا۔ ائیر گن اور اُس کے چھرّے بھائی جان کے کمرے سے بڑی مشکل سے ڈھونڈے۔ اس کام

میں بھائی جان کی ایک دوات بھی کام آگئی۔ بے چاری کا نیلا نیلا خون تمام گھاس پر پھیل گیا۔ خیر — ہم یہ چیزیں لے کر لان میں گئے تو شاہد ہمارا منتظر تھا۔ یہ طے پایا دس دس مرتبہ ٹرائی کی جائے گی اور جو جیت جائے اُسے ہارنے والا کون آئس کریم کھلائے۔ پہل شاہد نے کی۔ پہلی ٹرائی مِس ہوئی، دوسری ٹرائی بھی مِس ہوئی تو ہم بہت خوش ہوئے اور تیسری ٹرائی کے مِس ہونے پر ہم پاگل ہوتے ہوتے بچے کیوں کہ ہمیں اپنی فتح کا یقین ہو گیا تھا۔ لیکن یہ کیا اس کے بعد ساتوں کوششوں میں سے ایک بھی مِس نہ ہوئی۔ اب ہماری باری تھی۔ جب پہلی ٹرائی کی تو چھن کی آواز آئی۔ ہم جھلا گئے۔ غور کیا تو معلوم ہوا کہ چھرا ٹارگٹ کی بجائے ابو جان کی موٹر کار کے شیشے پر لگا ہے۔ ہمارا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا چند سیکنڈ ہم بُت بنے کھڑے رہے۔

اتنے میں ہماری آنکھوں نے اطلاع دی کہ ابو جان وجہ معلوم کرنے کے لیے لان میں آچکے ہیں۔ ہم نے ایئرگن وہیں پھینکی اور شاندار لانگ جمپ کا مظاہرہ کرتے ہوئے بھاگے۔ ابو اور ہمارے درمیان ہرڈل ریس شروع ہو گئی۔ لیکن ہائے ری قسمت ہماری جینز ایک ہرڈل (جھاڑی) میں اُلجھ کر رہ گئی۔ اتنے میں ابو بھی آگئے۔ پھر کیا ہوا۔ یہ پوچھ کر شرمندہ نہ کیجیے۔

پیارا کون!

محمد صالحین ایوب۔ کراچی

کسی جنگل میں ایک لکڑ ہارا اور اس کی بیوی رہتے تھے وہ دونوں بہت نیک اور خدا ترس تھے۔ نماز روزے کے بہت پابند تھے اور ہر دم پروردگار کا شکر ادا کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو چاند سے دو بیٹے عطا کیے تھے۔ ماں باپ اپنے بچوں سے بہت پیار کرتے تھے۔ بچے بھی بہت فرمانبردار تھے۔ کوئی ایسی حرکت نہیں کرتے تھے جس سے ان کے والد کو تکلیف ہو۔ اور زیادہ سے زیادہ ماں باپ کی خدمت کرتے اور دعائیں لیتے۔ ماں باپ ان کو پل بھر کے لیے بھی جُدا نہیں کرتے تھے کیوں کہ ان کی تمام



زندگی کا سرمایہ ہی بچے تھے۔
لکڑہارا جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتا اور شہر میں فروخت کر دیتا۔ اور شہر سے کھانے پینے کی اشیا خرید لیتا۔ اسی طرح ان کی زندگی بسر ہو رہی تھی۔ وقت گزرتا رہا۔ اب اُن کا باپ بوڑھا ہو چکا تھا اور اب وہ کام کاج نہیں کر سکتا تھا۔ دونوں بیٹے جوان ہو چکے تھے۔ دونوں بھائی جنگل میں جاتے اور لکڑیاں کاٹ کر شہر میں فروخت کر دیتے۔ جب وہ جنگل میں جاتے تو والدین ان کو خدا کے سپرد کر دیتے۔

ایک دن وہ جنگل کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں ان کو گھوڑے پر ایک شخص ملا۔ اس شخص نے پیار سے دونوں بھائیوں کو بلایا اور اُن سے کہا کہ میں تمھارے ساتھ والے گاؤں کا مالک ہوں میری زندگی کے دن پورے ہو گئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تمام دولت اور جائیداد کسی کے حوالے کر دوں اور اس کے لیے میں نے تمھارا انتخاب کیا ہے۔ مگر میری ایک شرط ہے وہ یہ کہ تم اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر میرے ساتھ میرے گاؤں چلو۔ میں تمھیں دولت سے مالا مال کر دوں گا۔ پھر تمھیں یہ سخت کام نہیں کرنا پڑے گا اور پھر عیش و عشرت سے زندگی گزارو گے۔ آؤ میرے ساتھ گھوڑے پر بیٹھ جاؤ۔

دونوں بھائیوں نے کہا کہ نہ ہمیں آپ کی دولت چاہیے اور نہ ہی آپ کی جائیداد۔ آپ کی تمام دولت سے زیادہ قیمتی ہمارے والدین ہیں۔ اس سے زیادہ قیمتی شے ہمیں کہیں نہیں ملے گی۔

اس نے لڑکوں کو بہت دولت کے لالچ دیے۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ وہ شخص چلا گیا۔ دونوں بھائی واپس گھر کو چل دیے۔ راستے میں ان کو ایک بزرگ ملے۔ انھوں نے کہا: پیارے بچو! تمھارے دل میں والدین کی کتنی قدر ہے تم امتحان میں پاس ہو گئے ہو اور اس نے ایک بڑی تھیلی اشرفیوں سے بھری ہوئی ان کو دی اور پھر چلا گیا۔

دونوں بھائی خوشی خوشی گھر چلے گئے۔

پیارے بچو! تم بھی ہمیشہ اپنے والدین کی خدمت کرنا اور دُنیا کی تمام قیمتی اشیا سے ان کی خدمت کو بہتر سمجھنا کیوں کہ اس سے اللہ تعالیٰ اور اس کے محبوب سرکارِ دو عالم

صلی اللہ علیہ وسلم دونوں خوش ہوتے ہیں۔

اکبر سومرو۔ بستی

گھر کی باتیں!

ایک شیخی باز لڑکے کو ہر بات میں شیخی بگھارنے کی عادت تھی۔ وہ گھر کی ایسی باتیں بھی بڑھا چڑھا کر بتاتا رہتا جو نہیں بتانی چاہیں۔ اُن میں اکثر اپنی امیری اور دولت مندی کے قصے ہوتے۔

ایک دن مدرسے سے آتے ہوئے اس کا کوٹ، جو ایک طرف سے اُدھڑا ہوا تھا، نظر آیا تو لڑکوں نے کہا: بس دیکھ لی تمھاری امیری کوٹ تک پھٹا ہوا ہے۔

اُس نے کہا۔ آج صبح خیال ہی نہ آیا ورنہ اور کوئی کوٹ بدل کر آتا۔ صرف یہی کوٹ تو نہیں۔ سچ جاننا کہ ہمارے پاس کوٹوں کی ایک پوری الماری ہے۔ اور نوٹوں کا ایک کالا بکس تو پورا بھرا ہوا ہے۔

دُوسرے نے کہا: کوٹ ہیں یا نوٹ پیپر جو پورے بھرے رکھے ہیں۔ شیخی باز بولا: تو گویا تم نے میری بات جھوٹ سمجھی؟ خدا گواہ ہے۔ کوٹوں کی الماری میں نوٹوں کی ایک سیاہ پیٹی بھری رکھی ہے۔ اِتفاق سے یہ باتیں ایک چور بھی سُن رہا تھا۔ جب لڑکے ایک دُوسرے سے رُخصت ہُوئے اور شیخی باز اپنے گھر روانہ ہوا تو چور چپکے سے اُس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ اور لڑکے کا مکان دیکھ آیا۔ جس کے چند دن بعد اُن کے ہاں چوری ہو گئی اور وہ چور وہی کالا بکس اُٹھا کر لے گئے۔

ایسے ہی کسی جج صاحب کا لڑکا حکومت جتانے کے لیے روز کہہ دیتا تھا کہ رات ہمارے ہاں ایک شخص آموں کا ٹوکرا لایا تھا اور کل ایک آدمی خربوزوں کا ٹوکرا بھر کر دے گیا تھا۔ اب بھی کہیں سے ایک گھی کا کنستر آ گیا ہے۔ یہ باتیں غلط تھیں یا صیح۔ مگر تمام لوگ جج کو بد دیانت جاننے لگے اور جب چرچا ہو کر حاکموں تک خبر پہنچی تو



بچارے جج صاحب یونہی مُفت میں بدل دیے گئے۔

تاریخِ انسانی کا ایک خونی واقعہ!-

منیر احمد - لاہور

جلیانوالہ باغ میں بسنے والے ہزاروں افراد نے ۱۹ اپریل ۱۹۱۹ء کو وطن عزیز کی قربانی کی خاطر اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیے۔ ان قیمتی جانوں کی قربانی دینے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ انگریز حکمران اس برصغیر میں غاصب بن کر آئے تھے۔ اُنھوں نے یہاں کے لوگوں کو عرصۂ دراز سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا۔ مدّتوں تک غلامی کا طوق پہننے کے بعد آزادی کا جذبہ غالب آیا اور اہلِ وطن نے انگریز سامراج سے وطن چھوڑنے کا مطالبہ کیا مگر انگریز حکمران نہ مانا۔

چنانچہ اہلِ وطن نے انگریزوں کے خلاف تحریک شروع کی۔ اس تحریک کے دوران میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ انگریزوں نے جس کی اجازت نہیں دی۔ لیکن آزادی پسندوں نے انگریزوں کے روکنے پر بھی جلسہ ملتوی نہ کیا۔ اسی دوران میں انگریزوں نے مسلمان قائد سیف الدّین کچلو کو گرفتار کر لیا۔ چنانچہ سٹیج پر جناب سیف الدّین کچلو کی تصویر کرسیٔ صدارت پر رکھی گئی اور اعلان کیا کہ اس جلسے کی صدارت سیف الدّین کچلو کر رہے ہیں۔ اسی اثناء میں انگریز جرنیل ڈائر اپنی مسلح افواج لے کر جلیانوالہ باغ کے قریب پہنچ گیا اور غیور جیالے آزادی پسندوں کو حکم دیا کہ وہ انگریزی ظلم و جور کے سامنے ہتھیار ڈال دیں۔ لیکن جلسہ گاہ میں موجود تمام مجاہدین نے یک زبان ہو کر کہا کہ ہمارا ملک خالی کر دو۔

یہ الفاظ سنتے ہی جنرل ڈائر نے اپنی فوج کو پوزیشن سنبھال لینے کا حکم دیا۔ پوزیشن سنبھالتے ہی فوج نے بندوقوں اور سٹین گنوں کے مُنہ نہتے شہریوں کی طرف کر دیے۔ ان مسلمان بہادروں نے موت و حیات کی اس کشمکش میں بھی ظلم و جور کی اس مضبوط دیوار کے سامنے اپنا سر نہ جھکایا۔



چند لمحوں بعد جنرل ڈائر نے نہتے شہریوں پہ فائرنگ

کا حکم دے دیا۔ گولیاں چلنا شروع ہوئیں۔ جس کے نتیجے میں 1200 افراد زخمی اور ۴۰۰ کے قریب اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔
ظلم کی انتہا دیکھیے کہ انھوں نے ننھے منّے بچّوں اور عورتوں کو بھی معاف نہیں کیا حتیٰ کہ شہداؑ کی نمازِ جنازہ ادا کرنے کی بھی اِجازت نہ دی اور لاشیں بے گور و کفن کئی روز پڑی رہیں۔ آخرکار جرأت کر کے نمازِ جنازہ امیرِ شریعت سیّد عطا اللہ شاہ بخاریؒ نے پڑھائی۔
عزیز بچّو اور طالب علم ساتھیو! دیکھا آپ نے کہ آزادی کے متوالوں اور ایمان سے سرشار مُسلمان جوانوں نے اپنی جانوں کا عظیم نذرانہ پیش کیا اور حصولِ آزادی کے لیے قربانی دے کر آنے والی نسلوں کے لیے مشعلِ راہ بن گئے۔
بچّو! ہمیں بھی چاہیے کہ ایک پاکستانی کی حیثیت سے وقت پڑنے پر وطنِ عزیز کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیں۔ کیوں کہ یہ ہمارا قومی اخلاقی اور مذہبی فریضہ ہے۔

دولت کے پُجاری!

سیماب گل (جھنگ)۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ملک ترکیہ میں ایک بوڑھی عورت رہتی تھی۔ جو کافی امیر تھی۔ اُس کا خاوند فوت ہو چکا تھا۔ اُس کی تین بیٹیاں تھیں لیکن بیٹا کوئی نہ تھا۔ اُس کا خاوند اُس کے پاس اتنی دولت چھوڑ گیا تھا کہ وہ ساری عمر شان و شوکت سے زندگی گزار سکتی تھی۔ جب اس کی تینوں بیٹیاں جوان ہو گئیں تو اُسے اُن کی شادی کی فکر ہوئی۔ اُس کی بڑی لڑکی حنا کے کئی رشتے آئے ہوئے تھے۔ لیکن وہ اتنے امیر نہ تھے۔ اس لیے بڑھیا نے ابھی اُنھیں کوئی جواب نہ دیا تھا۔ اُس کی بیٹی حنا چاہتی تھی کہ اُس کے لیے کسی ریاست کے مالک کا رشتہ آئے۔ اسی طرح اُس سے چھوٹی بہن زارہ بھی یہی چاہتی تھی۔ لیکن اُن کی چھوٹی بہن اُن کے بالکل برعکس تھی کہ اُس کا رشتہ شریف گھرانے میں ہو خواہ وہ لوگ غریب ہی کیوں نہ ہوں۔



بڑھیا بہت پریشان تھی کیوں کہ اس کی بڑی بیٹیوں



کی شان اور مرضی کے مطابق کوئی رشتہ نہ آیا تھا۔ اِدھر چھوٹی بیٹی سائرہ کا رشتہ ایک شریف گھرانے میں طے پا چکا تھا۔ لڑکا خوب صورت اور محنتی تھا۔ اس لیے سائرہ کے بارے میں اُسے کوئی فکر نہ تھی۔

ایک دن اُس نے اپنی تینوں بیٹیوں کو اپنے پاس بلایا اور بڑی بیٹیوں نارہ اور حنا سے کہنے لگی: بیٹیو! تم کو اب تک کوئی رشتہ پسند نہیں آیا۔ اسی وجہ سے تمھاری چھوٹی بہن بھی کنواری بیٹھی ہے۔ تمھیں اب کوئی نہ کوئی رشتہ پسند کر لینا چاہیے۔ یہ سُن کر اُنھوں نے بڑے غرور سے ناک چڑھائی اور بولیں۔ امّی جان! آپ بھی کیسی باتیں کرتی ہیں ہم کنگلوں سے شادی کس طرح کر سکتی ہیں۔ جو عیش ہمیں یہاں میسّر ہے، وہ ہمیں وہاں میسّر نہ ہو گا تو ہمارا کیا ہو گا۔

یہ سُن کر ماں نے کہا: تو ٹھیک ہے تم دونوں یونہی بیٹھی رہو۔ میں سائرہ کو بیاہ دیتی ہوں۔

اس طرح سائرہ کی شادی ہو گئی۔ وہ بیاہ کے بعد اپنے گھر چلی گئی اور سکون سے زندگی گزارنے لگی۔ اسی طرح دن گزرتے گئے۔ لیکن حنا اور زارہ کے لیے کوئی رشتہ نہ آیا۔ اِسی دوران میں سائرہ کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا۔ جس کا نام کاشف رکھا گیا۔ حنا اور زارہ اِس سے بہت پیار کرتی تھیں۔ حنا اور زارہ کے لیے آخرکار ایک امیر گھرانے سے دو بھائیوں کے رشتے آئے۔ جس کے لیے اُنھوں نے فوراً ہاں کر دی۔ دراصل یہ دونوں بھائی جوئے کے عادی تھے اور شراب بھی پیتے تھے کوئی شخص بھی اُن کو اپنی بیٹی دینے کے لیے تیار نہ تھا، ماں نے مجبوراً نے اُن سے اپنی بیٹیوں کی منگنی کر دی۔ اسی طرح اُن کی شادی بھی ہو گئی۔

چند دِن تو وہ لوگ ٹھیک رہے لیکن بعد میں اُنھوں نے پَر پُرزے نکالنے شروع کر دیے۔ وہ سارا سارا دن اور رات باہر گزارتے اور کبھی آتے بھی تو نشے میں دُھت۔ شراب کی وجہ سے اُنھوں نے اپنی جائیداد بیچنی شروع کر دی اور ایک دن اُن کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہ رہی۔ بڑھیا نے جب یہ حال دیکھا تو وہ اُن لوگوں کو گھر

لے آئی۔ یہاں آکر بھی دونوں بھائیوں کی وہی حالت رہی۔ وہ اپنی بیویوں کو مارتے پیٹتے اور کہتے کہ اپنی ماں سے ہمیں پیسے لا دو اور بیویاں بے چاری روتی پیٹتی ماں کے پاس جاتیں اور اُن کو پیسے لا کر دیتیں۔

اُن کے غم میں ایک دن ماں خالقِ حقیقی سے جا ملی۔ اس کے بعد تو دونوں بھائیوں کے اور عیش ہوگئے۔ انھوں نے بیویوں کو طلاق دے کر گھر سے نکال دیا اور اُن کی جائیداد پر قبضہ کر لیا۔ دونوں بہنیں آخر کار سائرہ کے ہاں گئیں۔ وہ اُن کی حالت دیکھ کر بہت کڑھی اور اُن کو اپنے گھر پہ رکھ لیا۔ زارہ اور رضا نے کہا کہ خدا نے ہمیں دولت کے لالچ کی بہت سزا دی ہے۔ اب تو ہم زندگی بھر ایسا گناہ نہ کریں گے۔ سائرہ نے اُن کی شادیاں ایک غریب لیکن شریف گھرانے میں کر دیں اور وہ بھی ہنسی خوشی رہنے لگیں۔

ریحانہ تحسین، سیالکوٹ)

لمبے بال!

"شرافت سے میرے دس روپے نکال دو۔ ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا" میں نے نہایت غصّے سے بھیّا احمد سے کہا۔

"بھئی! کون سے روپے؟ میں نے کبھی تم سے کوئی پیسہ نہیں لیا۔" احمد نے انجان بن کر کہا۔

"کیا، کیا، کیا اب تم مُکر بھی گئے۔ دیکھو اگر گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلتا تو میں ٹیڑھی انگلیوں سے بھی نکال سکتی ہوں۔ سیدھی طرح سے میرے پیسے واپس کر دو۔ ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔" میں نے پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا۔ "اُونہہ، مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔" احمد نے اپنے لمبے لمبے بالوں کو پیچھے جھٹکتے ہوئے کہا۔



"ٹھیک ہے میں بھی تمھیں دیکھ لوں گی"۔ میں یہ کہہ کر اپنے کمرے میں چلی آئی اور احمد سے بدلہ لینے کی ترکیبیں سوچنے لگی۔ اچانک ایک ترکیب میرے ذہن میں آئی اور میں خوشی سے



چیخ اُٹھی۔ اس کے بعد میں سیدھی ابّو کے کمرے میں گئی۔
میں نے ابّو سے کہا۔"ابّو، اگر میں احمد بھیّا کی "ٹنڈ" کرا دوں
تو کیا آپ مجھے انعام میں دس رُوپے دے دیں گے"؟
"بھئی! یہ ناممکن ہے۔ میں تو کہہ کہہ کے عاجز آ گیا ہوں
اس نالائق پر تو لمبے بالوں کا بھُوت سوار ہے" ابّو نے کہا۔
"ابّو صرف یہ کہہ دیں کہ دس رُوپے ضرور دیں گے تو
پھر وعدہ رہا کہ احمد بھیّا کے بال ضرور کٹیں گے"۔ "اگر یہ بات ہے تو پھر وعدہ رہا"۔ ابّو نے کہا۔ اس کے بعد میں نے ابّو کو اپنی سکیم بتائی اور اپنے اس شاندار منصوبے پر عمل کرنے کے لیے رات کا اِنتظار کرنے لگی۔ خُدا خُدا کر کے رات آئی اور میں اپنا ہتھیار یعنی قینچی لیے بھیّا احمد کے کمرے میں جا پہنچی۔ احمد بھیّا دُنیا سے بے خبر گھوڑے بیچ کر سوئے ہوئے تھے۔ مَیں نے آہستہ سے اُن کے بالوں کی ایک لِٹ کاٹ ڈالی۔ اس کے بعد میں نے اُن کے لمبے بالوں کو اس ترتیب سے کاٹا کہ سر کے درمیان کا حِصّہ تقریباً گنجا ہو گیا۔ اس کے بعد میں اپنی کامیابی پہ خُوش ہوتے ہوئے دُوسرے کمرے کی طرف چل دی۔

جب صُبح ہوئی تو گھر میں گویا طوفان آگیا۔ بھیّا احمد پُورے گھر میں چیخ چیخ کر پُوچھ رہے تھے: "یہ حرکت کِس نے کی ہے۔ میں اُس کا کچومر نکال دُوں گا"۔ سکیم کے مطابق ابّو آئے اور اپنی سخت آواز میں بولے: "یہ کیا شور مچا رکھا ہے تم نے میں نے کاٹے ہیں تمھارے بال۔ جاؤ حجام سے حجامت کروا کے آؤ"۔ ابّو نے مسکراہٹ چھپاتے ہوئے کہا۔ چاروناچار احمد کو ٹنڈ، کروانی پڑی۔ کیوں کہ بالوں کی ایسی "شاندار دُرگت" بننے کی وجہ سے وہ سرِ عام تو پھرنے سے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد احمد بھیّا اپنا چاند کی طرح چمکتا ہوا سر لیے گھر میں داخل ہوئے تو ہمارا ہنسی کے مارے بُرا حال ہو گیا اور ہم اپنے قہقہوں کا گلہ گھونٹتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئے۔

"نافرمانی"

(ماجد احسان گوجرانوالہ)

بہت پہلے کی بات ہے کہ مصر میں ایک شخص اپنی ضعیف والدہ کے ساتھ رہتا تھا۔ بے چارا محنت مزدوری کرتا اور اپنا اور اپنی ماں کا پیٹ پالتا۔ پانچ وقت کا نمازی تھا اور بہت ہی نیک تھا۔ جب حج کے دن قریب آئے تو وہ اپنی ماں کے پاس گیا اور کہا:

"ماں حج کے لیے قافلہ تیار ہو رہا ہے اگر تو اجازت دے تو میں حج کرنے چلا جاؤں" ماں نے اپنے بیٹے کی ساری بات سن کر کہا "بیٹا تجھے پتا ہے۔ میں بوڑھی ہو چکی ہوں۔ پتا نہیں آج ہوں، کل نہیں۔ تو اگلے سال حج کے لیے چلے جانا" بیٹے نے ماں کی بات سنی اور صبر شکر کر کے رک گیا۔ اسی طرح پورا سال گزر گیا جب دوبارہ حج کے دن نزدیک آئے تو بیٹے نے ماں سے پھر اجازت لینی چاہی لیکن ماں نے پھر اپنے بڑھاپے کا حوالہ دیتے ہوئے اُسے روک لیا۔ اسی طرح تین چار سال گزر گئے۔

اب حج کے دن نزدیک آئے تو بیٹے نے ماں کے حکم کو ٹھکرا دیا اور اُسے چیختی چلاتی چھوڑ کر حج کو روانہ ہو گیا۔ دو چار دن تک سفر کے بعد قافلہ جب ایک شہر کے نزدیک پہنچا تو قافلے والوں نے رات اس شہر میں گزارنے کا پروگرام بنایا اور ایک مسجد میں اپنے ڈیرے ڈال دیے۔ وہ رات کو تہجد پڑھنے کے لیے اٹھا اور وضو کے لیے نل پر آیا اور وضو شروع کر دیا۔ اسی اثنا میں ساتھ کے گھر کی دیوار پر سے ایک چور نے چھلانگ لگائی جو چوری کر کے جانے والا تھا کہ گھر والے جاگ اُٹھے اور چور گھبرا کر مسجد والی دیوار پر چڑھ گیا۔ اس نے چوری کا سامان اس شخص کے پاس پھینکا۔ اور خود بھاگ گیا۔



جب گھر والے اس چور کی تلاش میں مسجد میں پہنچے تو انھوں نے اُس شخص کو ہی چور سمجھ کر پکڑ لیا۔ اور اُسے قاضی کے سامنے لے گئے۔ قاضی نے چوری ثابت ہونے پر اُسے یہ سزا دی کہ اسے منہ کالا کر کے اور گدھے پر بٹھا کر سارے

شہر میں گھمایا جائے تاکہ دیکھنے والے اُسے دیکھ کر عبرت حاصل کریں اور چوری سے توبہ کریں۔ جب اُس آدمی سے یہ سلوک کیا گیا اور جب اُس کا گدھا شہر کے سب سے بڑے چوک میں پہنچ گیا تو اُس نے سپاہیوں کو رکوا کر لوگوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ اے "لوگو یہ سزا جو آج مجھے مل رہی ہے یہ چوری کی نہیں، نافرمانی کی سزا ہے۔ تم بھی توبہ کرلو کہ آگے سے کبھی ماں کی نافرمانی نہیں کرو گے"۔

میلہ : زاہدہ

یہ واقعہ ہمارے ساتھ اس وقت پیش آیا جب ہم ڈیرہ اسمٰعیل خان میں رہتے تھے۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان میں عید پر بہت بڑا میلہ لگا کرتا ہے۔ عید قریب آئی تو ہم نے ابو سے کہا "ہمیں میلے پر لے چلیں"۔

انھوں نے کہا "آج مجھے فرصت نہیں ہے"۔

اب ہم نے اپنی سہیلی جمیلہ سے ذکر کیا تو وہ بولی "ہم سب اکٹھے چلیں گے"۔ ہم راضی ہو گئے اور پھر ہم سب بہن بھائی جمیلہ کے ساتھ چل دیے۔ راستے میں ایک نالہ بہتا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ نالا پار کیا اور میلے میں پہنچے۔ سب نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیا کہ کہیں گم نہ ہو جائیں۔

اب ہم خوش خوش چڑیا گھر کی طرف گئے۔ باری باری سب چیزیں دیکھیں۔ ہمیں بھوک لگی تو ہم نے دکان سے مٹھائی خریدی۔ جب ہم کھانے لگے اور ہماری چھوٹی بہن نے بیدار کیا تو ہمارا بھائی طاہر نہیں تھا۔ ہم بہت گھبرائے اور لگے اُسے تلاش کرنے۔ جمیلہ کو ہم نے مغرب کی طرف سینما میں بھیجا کہ طاہر لوگوں کی بھیڑ میں اندر نہ چلا جائے۔ ہم خود اِدھر اُدھر تلاش کرتے رہے اور ساتھ اُونچی آواز میں روتے جاتے۔

کافی دیر تک تلاش کرنے پر بھی اس کا کوئی نشان نہ ملا۔ ہم سب ایک جگہ اکٹھے ہو گئے۔ ڈرتے ہوئے گھر بھی نہ جاتے تھے کہ امی جان پٹائی نہ کر دیں۔ ہم روتے

ہوئے نالے والی سمت آئے تو ہمارے بھائی طاہر ایک لڑکے کے ساتھ کھڑے رو رہے تھے جو انھیں نالا پار کروانے والا تھا۔

ہم نے لڑکے کا شکریہ ادا کیا جو اسے کب سے وہاں لیے کھڑا تھا۔ ہم نے طاہر کو اور سب لڑکوں کو ساتھ لیا اور گھر آ گئے۔ اس واقعہ کو بہت دیر ہو گئی لیکن ہمارے ذہن میں اب بھی تازہ ہے۔ جب یہ واقعہ یاد آتا ہے تو ہمیں پسینہ آ جاتا ہے۔

فضلِ ربّی۔ منگورہ

نیک نیّت :

پرانے زمانے میں ایک بوڑھا اور ایک جوان دونوں نے مل کر زمین خریدی اور اس میں گندم بوئی۔ کھیتی جب پک کر تیار ہوئی، کٹائی ہو چکی اور دونوں اپنا اپنا حصّہ تقسیم کرنے لگے تو بوڑھا اپنا حصّہ لیتا اور چپکے سے جوان کی طرف سرکا دیتا اور کہتا کہ شاید اس کی عمر میں برکت ہو اور اسے زیادہ گندم کی حاجت ہو۔ میں تو بوڑھا ہو چکا ہوں۔ مجھے زیادہ گندم کی کیا حاجت ہے۔

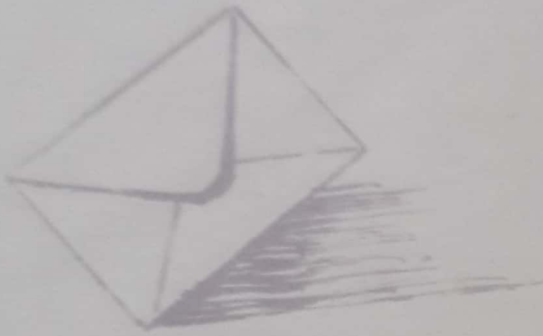
اُدھر جوان اپنا حصّہ لیتا تو چپکے سے وہ بھی گندم بوڑھے کی طرف سرکا دیتا اور کہتا کہ بوڑھا عیال دار ہے اسے زیادہ گندم درکار ہو گی۔

جُوں جُوں یہ دونوں آپس میں یہ معاملہ کرتے رہے گندم بڑھتی گئی اور ختم ہونے ہی میں نہ آتی تھی۔ جب یہ دونوں تقسیم کرتے کرتے تھک گئے تو دونوں نے ایک دوسرے سے اپنی اپنی نیت بیان کی تو پتا چلا کہ یہ برکت ان کی نیک نیتی کے باعث ہے۔

بادشاہِ وقت کو ان دونوں کے اس معاملے کا پتا چلا تو اس نے ان کے اُس ذخیرہ گندم سے ایک دانہ منگوا کر اپنے خزانے میں رکھا۔ اس کی برکت سے اس کے خزانے میں بھی برکت پیدا ہو گئی۔

نیک نیت ہو تو اللہ برکت فرما دیتا ہے۔

آپ کی رائے



جنوری کا تعلیم و تربیت ملا۔ سرورق دیکھ کر بے اختیار چوم لینے کو جی چاہا۔ کہانیاں تمام پسند آئیں۔ خاص طور پر اجودھن کا قیدی، مرغ کا گوشت اور حضرت ابراہیم اور مجوسی بہت پسند آئیں۔ اس کے علاوہ لطیفے اور ہونہار ادیب بھی پسند آئے۔

(ثمینہ سائرہ۔ راولپنڈی)

سرورق دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا بھائی جان مجھے آپ سے شکایت ہے آپ سب کے خط شائع کرتے ہیں مگر میرا خط شائع نہیں کرتے۔ کیا ہمارا کوئی حق نہیں۔ (ثروت یعقوب۔ لاہور)

سرورق پر اپنے پیارے نبی حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اقدس کی تصویر دیکھ کر سرور آگیا اور جب رسالہ کھولا تو ہر کہانی چاند کی طرح چمک رہی تھی۔ بھائی فیضی کی کہانی: چچا کے بچے نے ہنسا ہنسا کر لوٹ پوٹ کر دیا۔ باقی مضمونوں میں رحمتِ دو جہاں، حضرت ابراہیم اور مجوسی، بہن کا رشتہ اور مینڈک نے متاثر کیا۔

(راشد قمر۔ فیصل آباد)

نئے سال کا نیا شمارہ ملا سرورق دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ کہانیاں تقریباً تمام اچھی تھیں۔ ننھے ادیب اور لطیفے بھی شاندار تھے۔ مجموعی طور پر رسالہ شاندار تھا۔

(محمد اشفاق۔ سکندر آباد)

نئے سال کا پہلا تعلیم و تربیت ملا۔ سرورق بہت اچھا تھا۔ اس مرتبہ اجودھن کا قیدی سب سے اچھی تھی۔ دیگر کہانیوں میں مینڈک، چچا کے بچے اور مرغ کا گوشت اچھی تھیں۔

(طارق محمود عاصی۔ قادر پور راں)

اس دفعہ کا تعلیم و تربیت بہت ہی خوب صورت تھا۔ اتنا اچھا رسالہ

پیش کرنے پر میری طرف سے اور میرے گھر والوں کی طرف سے مبارک قبول کریں۔

(شیخ ثناء اللہ۔ فیصل آباد)

جنوری 1982 کا شمارہ ملا۔ آپ نے نئے عنوانات کا اضافہ کیا ہے، وہ بہت پسند آیا۔ سب سے پہلے جو کہانیاں پسند آئیں، ان میں بہن کا رشتہ، اجودھن کا قیدی اور مینڈک تھیں۔

(عامرہ انجم، ملتان)

جنوری کا چمکتا ہوا رسالہ ملا۔ پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ لطیفے بھی اچھے تھے۔ ہونہار ادیب بہت پسند آئے۔ سرورق بہت اچھا تھا۔ (فرخ ریاض۔ واہ کینٹ)

ماہ جنوری کا رسالہ ملا۔ واقعی بہت دلچسپ تھا۔ سب کہانیاں لاجواب تھیں لطیفے پڑھ کر دبی دبی ہنسی آئی۔ ہونہار ادیب اپنی مثال آپ تھے۔ دلچسپ اور عجیب نے معلومات میں اضافہ کیا۔

(طارق محمود بٹ۔ دینہ)

جنوری کا شمارہ دیکھا بہت ہی پسند آیا۔ خاص طور پر چچا کے بچے، ابراہیمؑ اور مجوسی بے حد پسند آئیں۔

(عامر فرخ۔ راولپنڈی)

جنوری 1982 کا شمارہ اپنی مثال آپ تھا۔ میں نے اپنی کہانی "ہونہار ادیب" میں دیکھی تو مجھے مکمل یقین ہو گیا کہ تعلیم و تربیت صرف اور صرف بچوں کا رسالہ ہے۔ نعت، چچا کے بچے، مرغ کا گوشت، مینڈک اور نظم میں مسٹر توڑ مروڑ بہت پسند آئیں۔ لطیفے بہت پسند آئے۔

(فہیم اکرم۔ پشاور)

جنوری کا چمکتا تعلیم و تربیت ملا۔ کہانیوں میں تقریباً سب ہی کہانیاں اچھی تھیں۔ لیکن سب سے اچھی کہانی بہن کا رشتہ تھی۔ نظموں میں اے نونہالو اور مسٹر توڑ مروڑ بہت پیاری تھیں۔ انعامی مقابلہ فوراً شروع کر دیں۔

(ریحانہ تحسین۔ سیالکوٹ)

جنوری کا شمارہ ملا۔ کہانیوں میں مینڈک، مرغ کا گوشت اچھی تھیں۔ تمام نظمیں اپنی مثال آپ تھیں۔ نئے سلسلے خیال اپنا اپنا اور مجھے ابھی تک یاد ہے بہت زیادہ پسند آئے لیکن اگر سلسلوں کے ساتھ مضمونوں میں بھی اضافہ کر دیا جائے تو بہت اچھا ہو گا۔ (فرخ تسنیم۔ سیالکوٹ)

نئے سال کا پہلا تعلیم و تربیت ملا۔ سرورق بہت اچھا تھا۔ اس دفعہ محمد یونس حسرت کی کہانی "اجودھن کا قیدی" سب سے اچھی تھی۔ دیگر کہانیوں میں مینڈک، چچا کے بچے اور مرغ کا گوشت اچھی تھیں۔

(طارق محمود عاصی، قادر پور راں)

جنوری 1982ء کا شمارہ ملا۔ سرورق ایسا تھا جیسے چاند۔ سرورق دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ جلدی جلدی پورا رسالہ پڑھ ڈالا۔ آپ کی رائے میں اپنا نام چراغ لے کر ڈھونڈا لیکن نہ ملا اور نئے شمارے کی ساری خوشیوں پر پانی پھر گیا۔

(عفت زہرا خاور۔ فیصل آباد)

جنوری کا خوبصورت اور اس مقدس مہینے کی مناسبت سے سرورق دیکھ کر خوش ہو گیا۔ نعتِ رسول بہت پسند آئی۔ کہانیوں میں چچا کے بچے اور مینڈک بہت پسند آئیں۔ اس کے علاوہ نئے سلسلے رسالے میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔

(نوید شہزاد، عرفانہ مجید، ندیم شہزاد۔ کراچی)

اس دفعہ تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ لطیفے بھی لاجواب تھے۔

(النعمان الحق۔ شجاع آباد)

کہانیوں میں مرغ کا گوشت، چچا کے بچے، اجودھن کا قیدی، مینڈک اور بہن کا رشتہ بہت اچھی تھیں۔

(عامر شہزاد۔ لاہور)

جنوری کا چمکتا دمکتا تعلیم و تربیت پڑھا جو بے حد پسند آیا۔ مضمونوں میں رحمتِ دو جہاں، حضرت ابراہیمؑ اور مجوسی، مرغ کا گوشت اور چچا کے بچے قابلِ تعریف تھے۔ دو نئے عنوانات شروع کرنے کا شکریہ۔

(ساجد علی۔ فیصل آباد)

اس دفعہ نظمیں بہت ہی پسند آئیں۔ کہانیوں میں اجودھن کا قیدی، مرغ کا گوشت اور چچا کے بچے بہت پسند آئیں۔

(محمد طارق صدیق، میاں چنوں)

جنوری کا شمارہ ملا۔ کہانیوں میں بہن کا رشتہ بہت پسند آئی۔ لطیفے پڑھ کر بہت ہنسی آئی۔

(سعود ندیم احمد۔ فیصل آباد)

اس دفعہ تمام کہانیاں دلچسپ تھیں، خاص طور پر اجودھن کا قیدی۔ لطیفے بھی خوب تھے۔

(اسماء، آسیہ، قدسیہ۔ کراچی)



مبارک علی ...



انجم عالم، شاہین عالم، مہ جبین عالم - [illegible]



شہلا پروین - کراچی



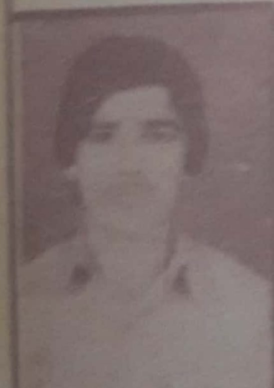
غلام رسول - لاہور



فیصل صغیر - گوجرانوالہ



حسن نبی - نواب شاہ



خلیل الرحمٰن - لاہور



عرفان سہیل - لاہور



ننھی شہزادی - لاہور



محمد وسیم - لاہور



شاہد اقبال - حیدرآباد

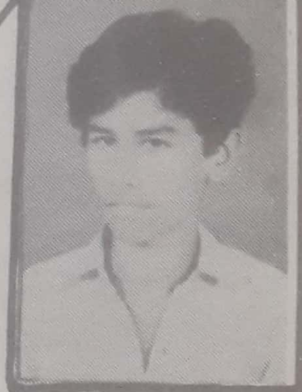

محمد ابراہیم ۔ پنڈ دادنخان


ثاقب نسیم صدّیقی ۔ لاہور


شمیم ۔ کاموںکے


اعجاز احمد ۔ لاہور


فیصل صغیر، گڑیا رانی، حسن صغیر ۔ گوجرانوالہ


ہمایوں خاں ۔ کراچی


محمدؐ ریاض ۔ لاہور


محمد سجاد ۔ لاہور


امتیاز علی مُنّا ۔ لاہور


زاہد عباس ۔ کوہاٹ


اسلم شہزاد ۔ سیالکوٹ


محمد علی ۔ کراچی


اظہر محمود ۔ لاہور

Phone: 301196
The TALEEM-O-TARBIAT Lahore
Pakistan's most widely read Urdu Magazine for Children of all ages